انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۲۸، شمارہ:۴، اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۴ء/ذی قعدہ-صفر المظفر ۳۶-۱۴۳۵ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... جامعۃ الفلاح

سید راشد حامدی فلاحی ...... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	:اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	:اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور
ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی
abulaalasubhani@gmail.com
+91-9891051676

برائے انتظامی امور وترسیل زر
عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی) 276121
+91-9453757380
hayatenau5@gmail.com

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۵
خوش قسمت کہ	سید راشد حامدی فلاحی	۷
ہمارے زمانے کا جامعہ	خالد سیف اللہ فلاحی	۹
اسلام، ایمان، احسان	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	۱۵
کار دعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری	ابوالمکارم فلاحی	۲۳
	ظفر احمد اثری	۲۵
	نسیم احمد غازی فلاحی	۲۷
	عبدالحلیم فلاحی	۳۰
	نعیم احمد غازی فلاحی	۳۲
	عبدالقوی فلاحی صدیقی	۳۶
	جوہر جاوید (فلاحی)	۴۰
	ذوالقرنین حیدر سبحانی	۴۳
	فخر الاسلام اعظمی (فلاحی)	۴۵
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۶)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۴۸
نگراں جو تھا اپنا۔۔۔	ڈاکٹر امتیاز وحید (فلاحی)	۶۲
کفارہ (افسانہ)	نسیم احمد غازی فلاحی	۶۸
شعر و نغمہ	عارف آئمی (احسان الحق فلاحی)، عزیز نبیل، اشتیاق دانش، ڈاکٹر عمیر منظر، شاکر الاکرم شاکر	۷۳
'فسوں' (ایک تنقیدی جائزہ)	ڈاکٹر محمد افضل فلاحی	۷۷
تعارف و تبصرہ	عشرت خاتون فلاحی، سعید اختر اعظمی، ابوالاعلی سید سبحانی، تنویر آفاقی فلاحی	۸۰
آپ کے خطوط	قارئین	۸۳
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۹۳
اخبار انجمن	ادارہ	۹۷

اپنی بات

میڈیا مفاد عامہ کے تحفظ کا اِک اہم ذریعہ ہے، اسے جمہوریت کا چوتھا ستون کہا گیا ہے۔ میڈیا کا کام محض خبروں کی نشر واشاعت نہیں ہے، بلکہ خبروں کی تحقیق کرنا، صحیح صحیح، غیر جانبدارانہ اور حق وانصاف پرمبنی تجزیہ پیش کرنا، رائے عامہ میں یکجہتی پیدا کرنا، مظلوموں کی حمایت کرنا، اور ملک کی عوام کے درمیان محبت، اخوت، اور رواداری کی فضا ہموار کرنا بھی میڈیا کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، اس طرح دیکھیں تو میڈیا کی ذمہ داریوں کا دائرہ کافی وسیع ہوجاتا ہے۔

میڈیا ذہن سازی اور رائے عامہ کی تشکیل کا ایک اہم ذریعہ ہے، کسی بھی سماج کا ایک بڑا حصہ اپنی سوچ اور فکر میں ان معلومات کا پابند ہوتا ہے، جو میڈیا اسے فراہم کرتا ہے، یہ وہی سوچتا ہے جو میڈیا چاہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو میڈیا کرانا چاہتا ہے، اس اعتبار سے میڈیا کی ذمہ داریاں دوچند ہوجاتی ہیں، اور اس کا تقاضا ہے کہ میڈیا کو بنیادی اور مثبت اقدار کا پابند بنایا جائے، اس کے ذریعہ جو کچھ بھی عوام کے سامنے آئے، وہ حقیقت اور سچائی پرمبنی ہو، سماج کی صحیح صورت حال اور اس کی حقیقی ضروریات کا آئینہ دار ہو، کسی بھی قسم کے بیرونی اثرات سے پاک ہو، اور اس سے صرف اور صرف عوام کی خیر خواہی پیش نظر ہو۔

ملکی میڈیا کی موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص سوچ کا پابند ہوتا جارہا ہے، اور ایک مخصوص پالیسی کے تحت کام کررہا ہے۔ اب یہ مفاد عامہ کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ بننے کے بجائے عوامی جذبات کے استحصال کا ذریعہ بنتا جارہا ہے۔ اس کے ذریعہ ملک کے اندر ایک ایسی سوچ اور ایک ایسا کلچر پروان چڑھایا جارہا ہے، جو کسی بھی سماج کے لیے انتہا درجہ مہلک اور خطرناک ہے۔ آج ملک میں میڈیا کے ذریعہ مغربی کلچر کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، تفریح اور اشتہارات کے نام پر ٹی وی چینلس اور اخبارات میں عریانیت کو خوب خوب فروغ دیا جارہا ہے، سماجی اقدار کو برطرف رکھتے ہوئے فحش تصاویر اور عریاں فلمیں نشر ہورہی ہیں، کہیں طب وصحت کے نام پر، کہیں آرائش وزیبائش کے نام پر اور کہیں اشتہارات کے بہانے انتہا درجہ کی مخرب اخلاق چیزیں الکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا دونوں سے مستقل نشر ہورہی ہیں، جن سے ہمارے ملک کی تہذیب وثقافت سنگین خطرات کا شکار بنتی جارہی ہے، اور ایک ایسی تہذیب وثقافت پروان چڑھ رہی ہے، جس نے مغرب کے خاندانی نظام اور وہاں کی معاشرت کو بری طرح تباہ کررکھا ہے۔

میڈیا آج تجارت کی شکل اختیار کر گیا ہے، اور جس طرح اشیائے خرید وفروخت کا معاملہ ہوا کرتا ہے کہ اس میں بنیادی طور پر منافع پیش نظر ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح میڈیا کے ساتھ بھی ہوا، منافع نے ترجیح اختیار کی، اور صحافتی اصول واقدار پیچھے جاتے چلے گئے۔ بڑی بڑی کمپنیوں نے اپنے اپنے چینل اور اخبارات شروع کر دیئے، اور ان کو اپنے مخصوص تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا دونوں کی صورتحال یکساں ہے۔ پیڈ نیوز کلچر نے اس کو مزید تقویت پہنچائی، صورتحال یہ ہے کہ جو حقائق میڈیا کے ذریعہ عوام کے سامنے آنے چاہیے تھے، ان پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے، اور جو چیزیں حقیقت کی دنیا سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں رکھتیں، یا بہت ہی معمولی درجے کی ہوتی ہیں، وہ میڈیا کے ذریعہ خوب بڑھا چڑھا کر عوام کے سامنے لائی جاتی ہیں، اور ان ہی 'حقائق' پر عوام الناس خوابوں کی ایک وسیع دنیا تعمیر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

میڈیا آج سماج میں فرقہ وارانہ فضا بنانے، اور سماج کو زبان، مذہب اور نسل کی بنیاد پر تقسیم کرنے، اور نفرت وعداوت کی ذہنیت کو پروان چڑھانے کا کام کر رہا ہے۔ عالمی پیمانے پر مغربی میڈیا کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بدترین سازشیں رچی جارہی ہیں، اور ان کی تصویر ایک انتہا پسند اور دہشت گرد کے طور پر پیش کی جارہی ہے۔ اس سازش کا حصہ ہمارے ملک کا میڈیا بھی بنتا جارہا ہے، اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا کوئی بھی موقع یہ میڈیا اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ملک کے کسی گوشے میں ایک دہشت گردانہ واقعہ پیش آتا ہے، اور ابھی اس سلسلہ میں باقاعدہ تفتیش کا آغاز بھی نہیں ہوتا کہ میڈیا کی جانب سے کچھ پولیس بیانات اور کچھ پریس ریلیز وغیرہ کو بنیاد بنا کر، جن کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی، مسلم نوجوانوں پر شک کی سوئی گھمانے اور پوری مسلم کمیونٹی کے خلاف نفرت اور عداوت کا جال بننے اور فرقہ وارانہ فضا بنانے کا کام شروع کر دیا جاتا ہے، اور یہی مسلم نوجوان جب عدالت سے بری ہو کر آتے ہیں، جبکہ ان کا کریئر تباہ ہو چکا ہوتا ہے، ان کے گھر اور خاندان کے افراد پورے سماج سے کٹ چکے ہوتے ہیں، دلوں میں ان کے اور ان کی کمیونٹی کے خلاف نفرت گھر کر چکی ہوتی ہے، اور وہ ایک عجیب وغریب قسم کے تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں، اس وقت یہی میڈیا جس نے اس کی گرفتاری کی فضا ہموار کی تھی، بالکل خاموشی اختیار کر بیٹھتا ہے، اور عدالت سے اس کے بری ہونے کی خبر تک شائع کرنے کے لیے اس کے یہاں بمشکل ہی کوئی چھوٹی سی جگہ مل پاتی ہے۔

ملکی میڈیا کی تصویر کا یہ ایک رخ ہے، یقیناً اس کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ منفی پہلوؤں کا تناسب مثبت پہلوؤں سے کہیں زیادہ ہے، ضرورت ہے کہ میڈیا کو بنیادی اور مثبت اقدار کا پابند بنایا جائے، تاکہ وہ سماج کے حق میں ایک مثبت اور تعمیری کردار ادا کر سکے۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

خوشا قسمت کہ

(ایک عزیز دوست کی خواہش پر جن کے بیٹے نے نہایت کم سنی میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی۔)

سید راشد حامدی فلاحی،شاہین باغ۔نئی دہلی

خوشا قسمت کہ جس نے آج تکمیلِ سعادت کی
زباں سے، دل سے قرآنِ مقدس کی حفاظت کی

خوشا قسمت کلام اللہ سے جس نے محبت کی
نگاہوں سے لیے بوسے، بچشمِ دل تلاوت کی

خوشا قسمت جمالؔ اظہار نے ایسا پسر پایا
عطا جس کو خدا نے کم سنی میں وہ امانت کی

امانت جس کو پہنچانے محمد مصطفیٰؐ آئے
امانت جس سے روشن ہوگئیں شمعیں ہدایت کی

امانت جس کو جبریل امیںؑ نے حفظ کروایا
امانت جس کی حق نے ذمہ داری لی حفاظت کی

امانت جس سے ابلیسِ لعیں بھی خوف کھاتا ہے
امانت جس نے بنیادیں ہلادیں سب ضلالت کی

اسی بارِ امانت کو اٹھالایا ہے اک بچہ
زمانے داد دے جوادؔ کے حسنِ جسارت کی

دعا یہ جدِامجد اشتیاؔق احمد کی ہے شاید
یہ تمثیلِ مجسم ہے انہی کے حسنِ سیرت کی
رخِ زیبا پہ سرخی اس طرح سے رقص فرما ہے
کہ جیسے جگمگا اٹھی ہیں قندیلیں مسرت کی
نظر میری نہ لگ جائے، میں آنکھیں بند رکھوں گی
نوائے محسنہؔ ہے انتہاؔ شاید محبت کی
بلائیں لے رہی ہیں پھوپھیاں حساؔنہ، ریحاؔنہ
کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں میں تمثیلیں محبت کی
یہاں آؤ، ادھر دیکھو، رخِ جواد کی جانب
دلیلیں ڈھونڈتا ہے ناسمجھ حسنِ حقیقت کی
دعا کرتے ہوئے دادا نے یوں اظہاؔر فرمایا
جگرخوں ہوتو قسمت بھی سنور سکتی ہے ظلمت کی
تمنا ہے کہ تیرا ہر عمل، حق کی ترازو ہو
عیاں ہو تیرے قول وفعل سے تقدیر جنت کی
یہ نکتہ کاش ملت کی سمجھ میں جلد آجائے
نہاں ہے آبرو قرآن کے پاروں میں ملت کی
فقط الفاظ رٹنے سے میسر کچھ نہیں ہوتا
عمل سے بھی شہادت چاہئے قرآں سے نسبت کی
یہی روحِ نبوت ہے، یہی کارِرسالت ہے
یہی معراج ہے راشدؔعروج آدمیت کی

دلِ جوادؔ میں روشن چراغِ آرزو کردے
سفیرِ جستجو کو تو شہیدِ جستجو کردے

ہمارے زمانے کا جامعہ

خالد سیف اللہ فلاحی، اردن

*(گزشتہ شماروں میں سند فضیلت حاصل کرنے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تاثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے، اس ماہ ۱۹۷۱ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک برادر بزرگ کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر**)*

میری پیدائش گونڈہ شہر میں ہوئی، اور نشو ونما شہر رامپور میں۔ رامپور میں ہم لوگوں کا کوئی ذاتی مکان نہیں تھا، اور والد صاحب درسگاہ جماعت اسلامی کے مسکن داخلی (بورڈنگ) کے اتالیق تھے، اس لئے حسب طلبِ جماعت والد صاحب ایک مکان سے دوسرے منتقل ہوتے رہے۔ حسب یادداشت ہم لوگوں کو دس مکانوں میں رہنے کا موقع ملا۔ ہم لوگوں کا آٹھواں مکان بورڈنگ سے ملحق تھا، اور بورڈنگ کی عمارت درسگاہ کی عمارت سے متصل تھی، میں درسگاہ کی آٹھویں کلاس میں تھا، جاڑوں کے دن تھے کہ مولانا جلیل احسن ندوی صاحبؒ کا ہمارے یہاں آنا ہوا۔ یہ جامعۃ الفلاح کے افتتاح کا دوسرا سال تھا، اور مولانا چھٹیاں گزارنے ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے، اس دوران میں نے مولانا کی کافی خدمت کی، میری خاطر تواضع اور خدمت سے متأثر ہوکر ایک دن وہ والد صاحب سے کہنے لگے کہ 'سیفی' (گھر کا نام) کو میں اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ والد صاحب مولانا کے مرید تھے، انہوں نے منظوری دے دی، ورنہ میرا خیال تھا کہ میں ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کروں، بہر حال مولانا نے فوراً پوسٹ کارڈ مانگا، اور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بلریا گنج کو لکھا کہ میرا جامعۃ الفلاح میں داخلہ لے لیا جائے، ڈاکٹر خلیل صاحب جامعۃ الفلاح کے پہلے ناظم تھے، چندروز کے بعد وہاں سے منظوری آ گئی، اُن دنوں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب صدر مدرس تھے۔ انہوں نے میرے ماموں مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب کو لکھا کہ جامعہ کو اساتذہ کی ضرورت ہے، اور ہم نے آپ کی بحیثیت مدرس تعیین کردی ہے، اس لیے آپ یہاں آ جائیں۔ داخلہ کی منظوری آنے کے

بعد جامعۃ الفلاح جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں، ہماری نانی اماں نے ہمارے لیے خرما اور کچھ خشک حلوے تیار کیے اور والدہ صاحبہ نے گھی اور آم و مرچوں کا اچار سامان میں رکھا۔

ہمارے عزیز گرامی ابوالمکارم صاحب جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم تھے، انہیں کے ہمراہ میں اور برادر مرحوم عرفان شمسی نے سفر کیا۔ رام پور سے شاہ گنج کے لیے ٹکٹ لیے گئے۔ والدہ صاحبہ نے زادراہ تیار کیا۔ والدہ صاحبہ اور سب بہن بھائیوں کو الوداع کہہ کر ریلوے اسٹیشن پہنچے، والد صاحب رخصت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آئے۔ سفر شروع ہوا، اور رات کے دو بجے شاہ گنج چھوٹی لائن کی گاڑی سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ اعظم گڑھ پہنچے تو ابوالمکارم صاحب نے دور کشے کیے، انہوں نے ہمیں اطراف شہر میں جا کر چھوڑا، وہاں پر ایک سامان بھرے ہوئے ٹرک میں سوار ہوئے، جس نے دو گھنٹے کے بعد ہمیں مدرسہ کے سامنے اتارا۔ دور سے مدرسے کا جائزہ لیا، میونسپلٹی کے سامنے والی عمارت تعلیم گاہ کی تھی، اس کے بائیں طرف طلبہ کا ہاسٹل، اور دائیں طرف جھونپڑی سے بنے ہوئے کلاسیز، یہ ابتدائی تعلیم کا اسکول تھا۔ ہوسٹل کی عمارت اس وقت آدھی تھی، بعد میں اس کی تکمیل ہوئی، جامعہ کی اصل عمارت کے بائیں طرف ایک جھونپڑی تھی جو مطبخ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ کھانے کے اوقات میں تعلیمی عمارت کے لان میں ٹاٹ بچھا دیئے جاتے تھے، اور کپڑے کا دستر خوان لگتا تھا، پلیٹیں رکھی جاتی تھیں، پھر کھانوں کی تقسیم ہوتی تھی، کھانے میں دال، روٹی، آلو کی ترکاری اور چاول ہوتا تھا، گوشت بس ہفتہ میں ایک بار کھانے کو ملتا تھا۔ اس وقت بجلی کا انتظام نہیں تھا، اس لیے ہر طالب علم کے پاس اس کی خصوصی لالٹین ہوتی تھی۔ رات میں سارا مذاکرہ لالٹین کی روشنی میں ہوتا تھا۔ اس وقت جامعہ میں مسجد نہیں تھی، تعلیم گاہ کے ہال میں نمازیں ہوتی تھیں۔ اسی ہال میں تین کلاسیں لگتی تھیں، بقیہ کلاسیں تعلیم گاہ کے لان میں لگا کرتی تھیں۔ ہمارے زمانے میں کرسی یا میز نام کی کوئی چیز جامعہ میں نہیں تھی۔ ہر طالب علم کے پاس اسمنٹ کی ٹاٹ ہوتی تھی جس پر بیٹھ کر وہ تعلیم حاصل کرتا تھا۔ مولانا حضرات بھی ٹاٹ ہی پر بیٹھتے تھے۔

جاڑوں کے دنوں میں کلاسیں جامعہ کے قریبی میدان میں گھاس پر ہوا کرتی تھیں، تاکہ دھوپ سے سردی کی کمی میں کچھ مدد لے سکیں۔ تعلیمی سلسلہ صبح سے ظہر کی نماز کے وقت تک چلتا رہتا تھا، اس کے بعد نماز اور دوپہر کے کھانے کے لیے وقفہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر کلاسیں شروع ہوجاتی تھیں، جو عصر کے وقت تک چلتی تھیں۔ عصر کی نماز کے بعد تعلیم سے فراغت ملتی۔ اور طلبہ فٹ بال کے کھیل اور تفریح میں مشغول ہوجاتے۔ جس کو کسی سامان کی ضرورت ہوتی وہ بازار چلا جاتا۔ کھیل اور تفریح کا سلسلہ مغرب کی نماز تک چلتا۔ مغرب کی نماز کے بعد رات کا کھانا لگتا، اس کے بعد مذاکرہ اور عشاء کی نماز، عشاء کی نماز تاریکی میں پڑھی جاتی، عام طور پر مولانا شہباز اصلاحی صاحبؒ امامت کرتے، فجر کی نماز مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

پڑھاتے۔عشاء کی نماز کے بعد پھر مذاکرہ شروع ہوجاتا۔عام طور پر طلبہ اپنی چارپائیوں پر مذاکرہ کرتے۔

بلریا گنج گاؤں میں جماعت اسلامی کے ایک خیر خواہ اور سرگرم رکن حکیم محمد ایوب صاحبؒ تھے، جب بھی کوئی طالب علم بیمار پڑتا تو اس کا علاج حکیم صاحبؒ مفت فرماتے تھے،اور کبھی انہوں نے دوا کے پیسے طلبہ سے نہیں لئے۔اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ جامعہ کے پچھم جانب ایک بزرگ رہتے تھے جن کے پاس دو بھینسیں تھیں، میں اور برادرم ابوالمکارم اور میاں عرفان شمسی انہیں سے دودھ لیا کرتے تھے، جو ناشتہ میں استعمال ہوتا تھا، یا اس سے چائے بناتے تھے۔اس وقت ہم لوگوں کو جو ناشتہ یا کھانا ملتا تھا وہ جیل کے کھانوں سے مشابہ تھا۔بس ہم لوگ اس کو گھی اور اچار کی مدد سے مزیدار بنانے کی کوشش کرتے تھے۔

جہاں تک یادداشت رہنمائی کرتی ہے میرا داخلہ ۱۹۶۶ء میں ہوا اور ۱۹۷۱ء میں جامعہ سے سند فضیلت حاصل کی، کیونکہ سید قطب رحمۃ اللہ علیہ کی پھانسی اور عرب ممالک کی اسرائیل سے شکست کے واقعات ہمارے جامعہ میں قیام کے درمیان ہی پیش آئے تھے،اور اس وقت ہم طلبہ و اساتذہ کی جانب سے کافی رنج وافسوس کے مظاہرے کئے گئے تھے۔اس وقت جامعہ اپنے ابتدائی دور سے گذر رہا تھا، اس لیے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد محدود تھی۔ہمارے اہم اساتذہ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا صغیر احمد اصلاحی، مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا شبیر احمد اصلاحی، مولانا شہباز اصلاحی۔اور جو اس وقت موجود نہیں تھے بلکہ ایک سال بعد آئے، وہ: ماسٹر افضال احمد (انگریزی)، ماسٹر مناظر حسین (سیاست و معاشیات) تھے۔ان محترم اساتذہ کی یاد ذہن میں پیوست ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، اور جنت میں ان کے درجات بلند فرمائے، اور ہم لوگوں کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔آمین

اس وقت اصل تعلیم گاہ کی عمارت اور ہاسٹل کی نصف عمارت کے علاوہ کوئی عمارت نہیں تھی، ابتدائی اسکول جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔اس وقت جامعہ میں پانی کا صرف ایک نل تھا، دوسرا نل بعد میں لگا۔اسی نل کے پاس ہم لوگ غسل کرتے تھے، غسل خانہ کے نام کی کوئی چیز جامعہ میں نہیں تھی، رہا وضو تو ہر طالب علم اپنا لوٹا بھرتا اور جہاں اس کا دل چاہتا وضو کے لیے بیٹھ جاتا۔

جامعہ میں نماز کا خاص اہتمام تھا، فجر کی اذان سے پہلے مولانا شہباز اصلاحی صاحبؒ ہر طالب علم کو اس کا نام لے کر آواز دیتے تھے، اس طرح سارے طلبہ اٹھتے اور وضو کرتے اور مسجد کا رخ کر لیتے، اس وقت مسجد کے لیے جامعہ کا ہال استعمال ہوتا تھا، میرے علم میں نہیں کہ نماز کے سلسلہ میں کوئی طالب علم کوتاہی برتتا ہو، یا نماز نہ پڑھتا رہا ہو۔فجر کی نماز کے بعد ہر طالب علم قرآن پاک کی تلاوت کرتا، اس وقت جامعہ میں صرف دو حافظ قرآن تھے، اساتذہ میں مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اور طلبہ میں مرحوم

عرفان احمد شمسی، آخر الذکر پابندی سے اول الذکر کو عصر کی نماز کے بعد قرآن سناتے تھے، تاکہ ان کا حفظ قرآن برقرار رہے۔ یہی ان کے والد بزرگوار کی نصیحت تھی، کہ روزانہ مولانا کو قرآن سنائیں۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا اس وقت تک عمارتِ مطبخ نہیں بنی تھی، مطبخ کی موجودہ عمارت بہت بعد میں بنی، ہم لوگ دوپہر کا کھانا، اور رات کا کھانا تعلیم گاہ کے لان کے سامنے والے میدان میں گھانس پر کھاتے تھے۔ ہمارے زمانے میں جامعہ میں پانچ حمام تھے، جن کا وصف میرے تصور یا تعبیر سے باہر ہے خاص طور پر بارش کے دنوں میں اُن کا استعمال ایک بڑی مصیبت تھی، یہ حمام موجودہ مسجد کے مشرقی دروازے کے قریب واقع تھے۔ میرے استاذ محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کو اللہ تعالی جزائے خیر دے، اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے کہ انہوں نے نئے طرز کے حمام کا انتظام کیا جو ہاسٹل سے متصل تھے، اور ان کے بغل میں ایک تیسرا نل لگایا گیا، اس طرح قضائے حاجات میں کافی سہولت ہوگئی۔

مولانا عبدالحسیب صاحب کی ان حمام کی تعمیر کے علاوہ اور بھی بڑی خدمات ہیں جن کا ذکر کرتا ہوں:

(۱) انہوں نے مدرسہ میں بجلی کی لائن بچھوائی، اس کے بعد لالٹینوں کا دور ختم ہوگیا۔ (۲) طلبہ کے لیے ریلوے ٹکٹ میں ڈسکاؤنٹ حاصل کیا، اس طرح ہم لوگ صرف دس فیصد کرایا ادا کرتے تھے۔ (۳) انہوں نے جامعہ کی شاندار مسجد کی تعمیر کرائی۔

میرا مولانا سے خاص تعلق تھا، اور وہ بھی میرے اوپر خاص شفقت فرماتے تھے، میں جب جامعہ میں داخل ہوا اس وقت نہ مجھے مبتدا و خبر کا کوئی علم تھا، نہ فعل فاعل اور مفعول کا، انہوں نے میرے اوپر کافی محنت کی، اور تدریسی اوقات کے بعد مجھے خصوصی تعلیم دی، اللہ تعالی انہیں جزائے خیر دے۔

رہا قیام تو وہ ہوسٹل میں رہا، میں رامپور سے چارپائی کی لکڑیاں اور پائے ساتھ لے گیا تھا، جامعہ کے ابتدائی درجات میں ایک استاد ماسٹر عبدالمجید صاحب پڑھاتے تھے، وہ اس سے پہلے درسگاہ اسلامی رامپور میں تدریسی خدمات انجام دے چکے تھے، اور والد محترم سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ والد محترم نے مجھے ان کے نام ایک خط دیا تھا، جس میں دیگر باتوں کے علاوہ ان سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ میری چارپائی بنوادیں۔ ماسٹر صاحب جو درسگاہ میں میرے استاد رہ چکے تھے، بڑی خوشی سے انہوں نے اس فرمائش کی تکمیل کی، اور میری چارپائی تیار ہوگئی، یہ اپنے طول و عرض کے لحاظ سے جامعہ کی سب سے بڑی چارپائی تھی کہ جس پر دو آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔ رام پور سے آنے والے طلبہ کو روم نمبر (۱) دیا گیا، اس کمرے میں میں، ابوالمکارم صاحب، اور برادرم عرفان شمسی سیٹ ہوئے، نیز اس زمانے کے امیر جماعت اسلامی حلقہ یوپی کے صاحبزادے حبیب اللہ بھی ہمارے ساتھ کمرے میں رہے، اگلے سال رام پور سے مولانا عبدالحی صاحب کے لڑکے کلیم میاں، اور بزرگوار توسل حسین صاحب کے صاحبزادے مشرف حسین صاحب بغرض

تعلیم آئے،ان کا قیام بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہوا۔ رہا طعام کا معاملہ تو ہم لوگوں کے کھانے بہت سادہ ہوتے تھے،کھانے میں دال کا ہونا ایک لازمی چیز تھی، ہمارے باورچی بہت مخلص وخدمت گار انسان تھے،اس وقت مجھے ان کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔عید الفطر ہم لوگ رامپور میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ مناتے تھے، کیونکہ رمضان میں جامعہ میں تعطیل رہتی تھی، البتہ عید الاضحیٰ وہیں مدرسہ میں منائی جاتی تھی، عید الاضحیٰ کے موقع پر مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کے ولولہ انگیز خطبے یاد آتے ہیں، وہ اپنے خطبوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح تھے،عید کی نماز بلریا گنج کی عیدگاہ میں پڑھی جاتی تھی،عیدگاہ سے واپسی میں ہم لوگ اپنے بعض اساتذہ کے ہمراہ حکیم ایوب صاحب کے مکان پر پہنچتے،تو وہ بہت خوشی سے ہم لوگوں کا استقبال کرتے،اور ہم لوگوں کی بھر پور ضیافت فرماتے،عید میں سویّاں بنانے کا کام میرے ذمہ تھا،مولوی رحمت اللہ اثری میری مدد کرتے،اور بڑی سی دیگ میں سویاں تیار کی جاتی تھیں،جس سے طلبہ کی ضیافت کی جاتی تھی، قربانی مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی انجام دیتے،اور بقرعید میں گوشت سے سیرابی کا اچھا موقع ملتا۔

مجھے اس وقت اپنے ساتھیوں کے نام یاد نہیں رہے لیکن حمد اللہ فراہیؒ،مظہر سید عالم اور محمد حسین میرے خاص دوست تھے۔حمد اللہؒ اور مظہر نے تو تعلیم مکمل کی،لیکن محمد حسین اپنی تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ طب پڑھنے چلے گئے۔دو دفعہ حمد اللہ فراہی مرحوم نے عید کے موقعہ پر پریہا آنے کی دعوت دی،ان کے والد بزرگوار اس وقت باحیات تھے، پریہا کا سفر بہت اچھا رہا،شام کے وقت وہاں پہنچے،مظہر صاحب اور بعض ساتھی ساتھ تھے، حمد اللہ نے رات کے کھانے کا بہت شاندار انتظام کیا اور رات گئے ان کے والد گرامی سے مولانا فراہیؒ کے سلسلے میں کافی باتیں ہوئیں۔فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کیا پھر حمد اللہ ہم لوگوں کو مولانا فراہیؒ کا بنگلہ دکھانے لے گئے، جو مولانا نے تعلیمی و تصنیفی غرض سے تعمیر کیا تھا، بنگلہ بہت خوبصورت تھا،لیکن مہجور تھا،عرصہ ہوا کہ حمد اللہ کا انتقال ہوگیا،اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، بہت با اُنس اور خوش اخلاق نوجوان تھے۔

ہمارے اور ہمارے اساتذہ کے درمیان جو رشتہ تھا وہ اسی قسم کا تھا جو باپ اور بیٹوں میں پایا جاتا ہے، ہم سب لوگ اپنے اساتذہ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور ہم سے جہاں تک ہوتا ان کی خدمت سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے،طلبہ کی بھی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور اساتذہ کی بھی،اس لیے دونوں کے درمیان کافی گہرا تعلق پایا جاتا تھا،اس زمانے میں زیادہ آسائش نہیں تھی،اس لیے ایک دوسرے کی گڑ اور پانی سے ضیافت کرتے تھے، یا اگر دودھ میسر ہوا تو چائے سے تواضع کی جاتی۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ہمارے ساتھی کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تو انہوں نے مدرسے پر ایک مرغے کی قربانی کی۔مرغ ہم ہی لوگوں نے پکایا اور سارے اساتذہ کو مدعو کیا۔تعجب کی بات کہ یہ مرغ سارے اساتذہ اور ہمارے ساتھیوں کے لیے کافی ہوا،اور سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔اس طرح کی برکت اب اس

زمانے میں نایاب ہے۔ گنے اور مٹر کے زمانے میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب تمام طلبہ کو اپنے گاؤں لے جاتے، اس دعوت عام میں تمام طلبہ گنے کا رس پیتے، گنا چوستے اور بھنی ہوئی مٹر کھاتے، اور اس بڑی کڑھائی کے پاس بیٹھتے جو شیرا اور گڑ بنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی، اسی کے قریب دو بیل گنے کا رس نچوڑ نے والی مشین (کولہو) کا طواف کرتے، آج کل طلبہ شاید ان دیہی مناظر سے محروم ہوں۔ رہا آپ کا سوال کہ جامعہ کے قیام کے مقاصد کے پیش نظر وہاں کا تربیتی اور تعلیمی ماحول کس انداز کا تھا؟ تو عرض ہے کہ ہمارے اساتذہ ہماری تعلیم کے ساتھ ہماری تربیت پر بھی کافی زور دیتے تھے، اور جو طالب علم جامعہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا تھا اس کو سزا ملتی تھی۔ جامعہ کے قیام کے دوران ہم لوگوں کا سارا رجحان تعلیم پر رہا، ہم لوگوں کا بیشتر وقت تفسیر قرآن کا مطالعہ، عربی ادب کی کتابیں المختارات، المشورات، یا دیوان الحماسہ کے حفظ و مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ مولانا فراہی کی کتابوں کا خاص اہتمام تھا، اسی طرح مولانا مودودی صاحب کی تفہیم القرآن اور دیگر دعوتی و تربیتی کتابیں، اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن ہمیشہ زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

ہم لوگوں کے زمانے میں کوئی عام مکتبہ نہیں تھا، برادرم مشرف حسین صاحب کو اللہ تعالی جزائے خیر دے کہ انہوں نے طلبہ سے چندہ جمع کیا اور جامعہ کے مکتبہ کے لیے پہلی الماری بنوائی، موصوف اس الماری کو اعظم گڑھ سے گھوڑا گاڑی میں لاد کر لائے پھر اُسے دعوتی و تربیتی کتابوں سے بھرا گیا۔ ہمارے زمانے میں درسی کتابیں طلبہ باہر سے نہیں خریدتے تھے، بلکہ جامعہ ہر طالب علم کے لیے درسی کتابیں فراہم کرتی تھی، مثلاً القدوری، الھدایۃ، بدایۃ المجتہد، وغیرہ، البتہ چھوٹی موٹی کتابیں ہم لوگ خود خرید لیا کرتے تھے۔ ہر ہفتہ عصر کے بعد انجمن طلبہ کا اجتماع ہوتا تھا، اور کوشش کی جاتی تھی کہ تمام طلبہ اس میں شریک ہوں اور مختلف موضوعات پر تقریریں کریں۔ گاؤں میں یا مدرسہ میں ہر مہینہ جماعت اسلامی کا اجتماع ہوتا تھا، جس میں ہم لوگ بڑے اہتمام سے شریک ہوتے تھے، بعض اوقات دوسرے گاؤوں میں بھی اجتماعات ہوتے اور دو تین دن کے لیے وہاں کیمپ لگتے، جس میں مقررین باہر سے بلائے جاتے، اس میں بھی ہم لوگ بڑے اہتمام سے شریک ہوتے، ان اجتماعات کا تربیتی لحاظ سے ہم لوگوں پر کافی اثر پڑتا۔ جامعہ میں ہر سال طلبہ کی جانب سے ایک مظاہرہ ہوتا تھا جس میں طلبہ مختلف سرگرمیاں دکھاتے، شاندار تقریریں ہوتیں، نظمیں پڑھی جاتیں اور گاؤں کے بہت سے لوگ اس میں شریک ہوتے۔

جامعہ کی مسجد تیار نہیں ہوئی تھی اس لیے جمعہ کی نماز کے لیے ہم لوگ بلریا گنج کی جامع مسجد جاتے تھے، اس میں خطبے جامعہ کے اساتذہ ہی دیا کرتے تھے، میرے زمانے میں اکثر خطبے مولانا شہباز صاحبؒ، مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب، اور بعض اوقات مولانا جلیل احسن ندویؒ دیتے تھے، یہ خطبے قریب ایک گھنٹے کے ہوتے تھے، اور مسجد میں پنکھے نہ ہونے کے سبب ہم لوگ پسینے میں نہا جاتے۔ ●■●

اسلام،ایمان،احسان

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی،
اسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ای میل:drfahadamu@yahoo.com

ترغیب و ترھیب کی روایت ہے بحوالہ بخاری و مسلم کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''تم لوگ مجھ سے دین کی باتیں پوچھو''،لیکن لوگوں کے اندر ادب و تعظیم کی وجہ سے اس درجہ ہیبت بیٹھ گئی تھی کہ انہوں نے سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔

اسی اثنا میں ایک شخص آیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ پھر اس نے سوال کیا:اے اللہ کے رسولؐ اسلام کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:''کسی کو خدا کی شریک نہ بنانا،زکوٰۃ دینا،اور رمضان کے روزے رکھنا''۔آپؐ کا یہ جواب سن کر اس نے کہا: آپ نے ٹھیک بتایا۔ پھر اس نے پوچھا:اے اللہ کے رسول ایمان کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:''اللہ کو ماننا،ملائکہ کو ماننا،اس کی کتاب کو ماننا،اس کے رسولوں کو ماننا،مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لانا،اور اس بات پر ایمان لانا کہ جو کچھ اس دنیا میں ہوتا ہے خدا کی مشیت اور اس کے فیصلے کے تحت ہوتا ہے''۔اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا،اور آپؐ سے تیسرا سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:''احسان یہ ہے کہ تم اللہ سے اس طرح ڈرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو،اس لئے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا۔''

اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ پھر پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟

آپؐ نے فرمایا:''جس آدمی سے سوال کیا جا رہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، البتہ میں اس کی علامتیں بتا سکتا ہوں۔

''جب تم دیکھو کہ عورت اپنے مالک کی ماں بن گئی ہے تو سمجھ لو کہ قیامت قریب آگئی ہے۔ یہ اس کی نشانی ہے''۔

''اور جب تم دیکھو ننگے پیر چلنے والوں کو، ننگے جسم رکھنے والوں کو جو بہرے گونگے ہیں، ان کے ہاتھ میں زمین کا اقتدار آ گیا ہے، تو یہ بھی قیامت کی علامتوں میں سے ہے''۔

''اور جب تم مویشیوں کے چرواہوں کو دیکھو کہ وہ بلند و بالا عمارتیں بنوانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہوں تو یہ بھی قیامت کی علامت میں سے ہے۔''(۱)

بخاری کی بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کے چلے جانے کے بعد صحابہ سے پوچھا، کیا تم جانتے ہو، یہ کون شخص تھا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے جواباً فرمایا: ''وہ جبرئیل تھے، وہ تمہیں دین کی تعلیم دینے آئے تھے''۔(۲) اسی مناسبت سے یہ حدیث جبرئیل کے نام سے مشہور ہوگئی۔

قرآن کریم کی آیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام کی اصطلاحیں عام طور پر ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ اس لئے علمائے اسلام اور مفسرین قرآن کے مطابق اسلام اس دین حق کا نام ہے جو اللہ نے نوع انسانی کے لئے نازل کیا ہے اور اس کے مفہوم میں ایمان اور اطاعت دونوں شامل ہیں۔ مسلم وہ ہے جو سچے دل سے اللہ کو مانے اور عملاً اس کی اطاعت کرے۔ اس لئے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ اسلام لانے کا مطلب ہمیشہ ایمان کے بغیر اطاعت اختیار کر لینا ہے۔(۳) اسی طرح یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ ایمان اور مومن کے الفاظ قرآن مجید میں لازماً سچے دل سے ماننے ہی کے معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں، بلاشبہ اکثر مقامات پر یہ الفاظ اسی مفہوم کے لئے آئے ہیں لیکن بکثرت مقامات ایسے بھی ہیں جہاں یہ الفاظ ظاہری قرارِ ایمان کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لئے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔'' (الحج ۲۲: ۷۸) یہی جامع مفہوم ایمان اور مومن کی اصطلاحات کے لئے بھی قرآن میں بیان ہوا ہے۔ سورہ المومنون کی ابتدائی آیات کا مطالعہ کیجئے:

ترجمہ: ''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے، جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں۔ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اپنی امانتوں

اوراپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں،اوراپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔''(المومنون۲۳:۱-۹)

تاہم سورہ الحجرات میں چند بدوی قبائل کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے اسلام اور ایمان میں قدرے فرق کیا ہے۔ یہ وہ بدوی قبائل تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر اس خیال سے مسلمان ہو گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی پکڑ سے محفوظ بھی رہیں گے اور اسلامی فتوحات کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہوں گے۔ یہ لوگ حقیقت میں سچے دل سے ایمان نہیں لائے تھے،محض زبان سے اقرارِایمان کر کے انہوں نے مصلحتاً اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرالیا تھا۔ روایات میں متعدد قبائلی گروہوں کے اس رویہ کا ذکر ہے مثال کے طور پر مزینہ،جہینہ،اسلم،اشجع،غفار۔ خاص طور پر بنی اسد بن خزیمہ کے متعلق ابن عباس اور سعید ابن جبر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خشک سالی کے زمانہ میں وہ مدینہ آئے اور مالی مدد کا مطالبہ کرتے ہوئے بار بار انہوں نے رسول اللہ سے کہا کہ''ہم بغیر لڑے بھڑے مسلمان ہوئے ہیں۔ہم نے آپؐ سے اس طرح جنگ نہیں کی جس طرح فلاں اور فلاں قبیلوں نے جنگ کی ہے۔'' اس سے ان کا صاف مطلب یہ تھا کہ اللہ کے رسول سے جنگ نہ کرنا اور اسلام قبول کر لینا ان کا ایک احسان ہے جس کا معاوضہ انہیں رسول اللہ اور اہل ایمان سے ملنا چاہیے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے دعوائے ایمان کو چیلنج کیا۔ یہ آیات ہر ایک کے لئے درس عبرت ہیں:

ترجمہ:''یہ بدوی کہتے ہیں کہ''ہم ایمان لائے۔''ان سے کہو،تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ''ہم مسلمان ہو گئے۔''ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری اختیار کرلو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا رحیم ہے۔حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا،اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔وہی سچے لوگ ہیں۔ان سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ان سے کہو، اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہو۔اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اس کی نگاہ میں ہے۔''(الحجرات ۴۹:۱۴-۱۸)

ایمان اور اسلام کے مفہوم کی تعیین کرتے ہوئے امام ابن حزم نے''الفصل''میں،امام غزالی نے ''احیاءعلوم الدین''میں،اور امام شہرستانی نے''الملل''میں مختلف آراء کو جمع کر دیا ہے:

(۱) بعض کے نزدیک دونوں اصطلاحوں میں تخالف ہے،ان کے معنیٰ الگ الگ ہیں، یا ان

میں عموم وخصوص کا فرق ہے۔

(۲) دونوں میں تداخل ہے یعنی ایمان دراصل اسلام ہی کا ایک مقام ہے۔

(۳) اسلام اور ایمان میں ترادف ہے یعنی دونوں الفاظ متحد المعنیٰ ہیں (۴)

امام قسطلانی نے اس کی مزید صراحت کی ہے کہ اسلام اور ایمان حکماً جدا جدا نہیں ہیں۔ تصدیق میں دونوں متحد ہیں، البتہ مفہوم میں مختلف ہیں۔ ایمان کا مفہوم تصدیق قلب ہے اور اسلام کا مفہوم اعمالِ جوارح۔ شرع میں یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کو مومن کہیں اور مسلم نہ کہیں، یا مسلم کہیں اور مومن نہ کہیں۔ اور وحدت سے ہماری یہی مراد ہے۔ (۵)

حدیث جبرئیل میں اسلام اور ایمان کی وضاحت کے بعد احسان کی بھی تعریف کی گئی ہے، احسان یہ ہے کہ تم اللہ سے اس طرح ڈرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لئے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

احسان کے معنی ہیں کسی کام کو عمدہ انداز میں اور سلیقے سے کرنا۔ آدمی اللہ کا متقی بندہ اسی صورت میں بن سکتا ہے اور حسنِ نیت اور حسنِ عمل کی دولت اسے اسی وقت مل سکتی ہے جبکہ اس کے ذہن پر ہمہ وقت یہ تصور چھایا رہے کہ گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے، خدا کے سامنے موجود ہے یا پھر یہ سمجھے کہ خدا تو بہرحال اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے بغیر کسی کام میں حسن پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس مفہوم کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کی روایت حضرت شداد بن اوسؓ نے کی ہے۔

''اللہ نے ہر کام میں حسن اور خوش سلیقگی کو واجب کیا ہے۔ جب تم قتل کرو تو اچھی طرح سے قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔ تم اپنے خنجر کی دھار تیز کرلیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہونچاؤ۔'' (۶)

احسان کے اس جامع نبوی مفہوم کے لئے قرآن کریم نے تزکیہ کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اسے انبیاء کے فرائض میں شمار کیا ہے۔ سورہ الجمعہ میں قرآن اعلان کرتا ہے:

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے امتوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' (الجمعہ۶۲:۲)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی احسان کی تعریف کرتے ہوئے اسے شرعی فرائض واعمال کا ایک اہم رُخ قرار دیتے ہیں جس کا راست تعلق تہذیب نفس سے اور نفس کو مطلوبہ کیفیات اور صفات سے ہم آغوش کرنے سے ہے۔ تحریم وتحلیل کے پورے عمل میں شریعت کا محور اعمال اور شرعی مکلفات ہیں، اور علم احسان کا محور تہذیب وتزکیہ ہے۔ ایک میں ظواہر احکام کی بھرپور رعایت ہوتی ہے اور ان کی علانیہ بجا

آوری مطلوب ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے میں اعمال کی کیفیت اور ان کے اندرونی جذبہ پر نگاہ ہوتی ہے اوراس کا مدار وجدان پر ہوتا ہے، اس طرح کہ انسان خود اپنا طبیب بن جاتا ہے۔(۷)

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اسلام، ایمان اور احسان تینوں مطلوب ہیں۔ تصدیق قلبی سے آگے اعمال صالحہ کی انجام دہی اور اطاعت خدا ورسول میں جذبۂ اخلاص وللّٰہیت کی کارفرمائی سے ہی بندہ اللہ کی رضا کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے صادقین، قانتین، مخلصین، محسنین، عابدین، خاشعین، متوکلین، صابرین، اولیاء، ابرار وغیرہ ناموں سے اللہ کے نیک بندوں کا ذکر کیا ہے، اوراہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ

ترجمہ: ''تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار دین خالص اللہ ہی کا حق ہے۔'' (الزمر ۳۹:۲-۳)

یہاں اہل ایمان سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور یہ عبادت ایسی ہو جس میں دین اللہ کے لئے خالص ہو۔ لفظ دین میں پوجا و پرستش اور عاجزانہ اطاعت اور برضا ورغبت فرماں برداری دونوں مفہوم شامل ہیں۔ اسی سورہ میں آگے مزید فرمایا:

ترجمہ: ''پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس کے، قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔''

احسان اور تزکیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور واضح ہدایات پر صدق دل سے عمل کیا جائے۔ شریعت کی نگاہ میں مقصد کی پاکیزگی کے ساتھ اس کے حصول کے لئے اختیار کیا جانے والا وسیلہ بھی جائز، پاکیزہ اور موافق شریعت ہونا چاہیے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے حسنِ عمل کی تفسیر أخلص اور أصوب عمل سے کی ہے۔ جب ان سے أخلص اور أصوب عمل کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا:

ترجمہ: عمل اگر خالص ہو مگر درست نہ ہو تو وہ مقبول نہ ہوگا۔ اور اگر درست ہو مگر خالص نہ ہو تو بھی قبول نہ کیا جائے گا۔ تا آنکہ وہ خالص بھی ہو اور درست بھی۔ خالص کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ عمل اللہ کے لئے ہو اور درست کے معنیٰ یہ ہیں کہ عمل سنت کے مطابق ہو۔'' (۸)

اسلام، ایمان اور احسان کے ان تینوں مدارج پر کلاسیکی اسلامی ادبیات میں ہونے والی یہ بحث آج زیادہ مفید، موزوں اور برمحل معلوم ہوتی ہے جبکہ اسلام پسندی کا دعویٰ کرنے والی بعض جماعتیں تکفیر وتشدد پر اتر آئی ہیں۔ افغانستان میں طالبان کے ذریعہ خواتین کے حقوق پر دست درازی، نائیجیریا میں بوکوحرام کی انتہا پسندانہ سرگرمیاں، اور اس کے مقابلے میں بوکوحلال کا قیام، عراق میں داعش (دولۃ اسلامیۃ فی

العراق والشام) کی سرپرستی میں ابوبکر البغدادی کی اسلامی خلافت کی تشکیل اس رجحان کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تنظیمیں اور جماعتیں احیائے اسلام کی جدوجہد میں مخلص ہوں مگر اسلامی شریعت نیت کی صداقت کے ساتھ طریق کار کی درستگی و پاکیزگی کو یکساں درجہ میں اہمیت دیتی ہے۔ مقصد صحیح و صادق ہوتو اس کے حصول کے لئے استعمال ہونے والے وسائل کا بھی پاکیزہ اور درست ہونا ضروری ہے۔

دوسرا نکتہ جو زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اسلام سے ایمان اور احسان تک کا سفر تشدد اور دھینگا مشتی کے ذریعہ طے نہیں ہوسکتا۔ روحانیت کا ارتقاء ہمیشہ ترغیب اور تحسین کے سائے میں ہوا ہے۔ ترہیب اور ہنگامہ آرائی سے نفرت کو فروغ ملتا ہے، محبت کو نہیں۔ جو لوگ اسلام کے اولین مرحلے پر قدم روک چکے ہیں اور ظاہری انقیاد و استسلام سے آگے بڑھ کر ایمان و احسان کی اعلیٰ روحانی منزلوں تک رسائی سے مایوس ہو چکے ہیں، انہیں مسلمانوں کی فہرست سے خارج کیا جاسکتا ہے، نہ ان پر جبر و اکراہ کی کوئی پالیسی تھوپی جاسکتی ہے کہ دین میں جبر و اکراہ مطلقاً حرام ہے۔ قرآن کے اس واضح حکم کو اسلام کا نام لینے والے افراد اور جماعتوں کو ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہئے کہ:

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت ضلالت سے الگ ہوکر واضح ہوچکی ہے۔'' (البقرہ:۲۵۶)

حواشی و تعلیمات

(۱) بخاری شریف میں حدیث کے الفاظ قدرے مختلف ہیں گرچہ مفہوم تقریباً وہی ہے۔ اس روایت میں پہلے ایمان سے متعلق سوال ہے پھر اسلام اور احسان کی تعریف دریافت کی گئی ہے۔ کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ، حدیث نمبر ۴۸،

(۲) حدیث کے الفاظ ہیں: ھذا جبریل جاء یعلم الناس دینھم، نفس مصدر

(۳) گرچہ بعض احادیث صحیحہ میں اشارہ ملتا ہے کہ اسلام کی اصطلاح ظاہری طور سے سر تسلیم خم کردینے اور اطاعت و فرماں برداری کا دعویٰ کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے، اسی لئے امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح، کتاب الایمان میں ایک باب قائم کیا ہے: اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ و کان علی الاستسلام أو الخوف من القتل لقولہٖ تعالیٰ قالتِ الأعراب آمنا قل لم تؤمنوا و لکن قولوا أسلمنا، فاذا کان علی الحقیقۃ فھو علی قولہٖ جل ذکر ان الدین عند اللہ الاسلام الآیۃ۔

(باب ۱۹ر کبھی اسلام سے اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ ظاہری تابعداری یا جان کے خوف سے سر جھکانے کے معنی میں وہ استعمال ہوتا ہے، جیسے سورہ الحجرات میں اللہ کا فرمان ہے: ''بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان

لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم نے ایمان قبول نہیں کیا بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے۔" اگر اسلام کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں تو اللہ کے اس قول کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔)

اس کے بعد امام بخاری نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ

ترجمہ: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو مال عطا کیا۔ اس مجلس میں سعد موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے ایک شخص کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا۔ میں نے عرض کیا۔ اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو نظر انداز کیا۔ بخدا میں اسے مومن سمجھتا ہوں؟ آپؐ نے جواب دیا: (وہ مومن ہے) یا مسلم؟ وہ کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر مجھے اس کے بارے میں جو معلومات تھیں اس نے مجبور کیا کہ میں اپنی بات دہراؤں، چنانچہ میں نے دوبارہ عرض کیا: آپ نے اسے نظر انداز کیا جبکہ میں اسے مومن سمجھتا ہوں؟ آپؐ نے پھر وہی جواب دیا: "مومن یا مسلم"؟ راوی کہتے ہیں کہ میں چپ ہوگیا مگر میں جو اس کے حال سے واقف تھا اس نے مجبور کیا کہ اپنی عرضداشت دہراؤں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار وہی جواب دیا۔ اس کے بعد فرمایا: اے سعد! میں ایک شخص کو جبکہ دوسرا مجھے زیادہ محبوب ہوتا ہے کچھ عطا کرتا ہوں، مبادا کہ اللہ اسے جہنم میں اوندھے منہ گرادے۔" کتاب الایمان، باب ۱۹/، حدیث نمبر ۲۶/۔

(۴) الغزالی، ابوحامد، احیاء علوم الدین، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء، جلداول، ص:۱۱۲۔۱۱۳، امام غزالی نے دونوں اصطلاحوں میں ترادف کو ظاہر کرنے کے لئے سورہ الذاریات: ۳۵۔۳۶، سورہ یونس: ۸۴، اور بعض احادیث کو نقل کیا ہے۔ اسلام و ایمان کے درمیان تداخل کی حمایت میں انہوں نے امام طبرانی کی حدیث عمرو بن عنبسہ کے آخری حصہ سے استدلال کیا ہے جس میں سوال کیا گیا کہ "کون سا عمل افضل ہے"؟ آپؐ نے فرمایا: "اسلام"، سوال ہوا کہ کون سا اسلام افضل ہے؟ تو آپؐ نے جواب دیا کہ "ایمان"۔ اور دونوں اصطلاحوں میں تخالف کے لئے آپ نے الحجرات: ۱۴/ سے دلیل فراہم کی ہے۔

(۵) القسطلانی، احمد بن محمد الخطیب، ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری، مطبعۃ امیریہ بولاق، طبع ہفتم ۱۳۲۳ھ، الجزء الاوّل ص: ۱۱۰۔۱۱۱

(۶) النووی، یحییٰ بن شرف، شرح صحیح مسلم، دارالخیر، طبع پنجم، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، حصہ: ۱۳/، ص: ۹۲/، حدیث نمبر ۱۹۵۵/۔ امام نوویؒ نے اس حدیث کو ان احادیث میں شمار کیا ہے جو اسلام کے قواعد وارکان کی جامع ہیں۔ دیکھئے نفس مصدر، ص: ۹۳/

(۷) دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، تحقیق: السید سابق، قاہرہ، جلد دوم، ص: ۵۶۰۔۵۶۱

(۸) ابن تیمیہ، مجموع فتاویٰ ابن تیمیّۃ، الریاض، ۱۳۸۱ھ، جلد یازدہم، ص: ۶

کار دعوت

کے لیے فارغین مدارس کی تیاری

- ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں دعوت دین کی کیا اہمیت ہے ؟
- اس سلسلے میں مدارس اسلامیہ ہند پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟
- مدارس اسلامیہ کا دعوت دین کے سلسلے میں اب تک کیا کردار رہا ہے ، اور موجودہ صورتحال کیا ہے ؟
- کار دعوت کے لیے فارغین وطلبہ مدارس کی تیاری کیوں ضروری ہے ؟
- مدارس اسلامیہ (اور ان سے وابستہ طلبہ، اساتذہ اور فارغین) اس سلسلے میں کیا کچھ عملی اقدامات کرسکتے ہیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو "کاردعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری" سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے ، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کے ساتھ ساتھ کچھ عملی اقدامات کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

● **ابوالمکارم فلاحی ازہری**، نئی دہلی۔موبائیل نمبر: **9811441343**

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دینِ حق کی طرف انسانوں کو دعوت دینا امت مسلمہ کا اہم ترین فریضہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ'' (آل عمران: ۱۱۰) اور دوسری جگہ امت وسط ہونے کی حیثیت سے امت مسلمہ پر شہادت حق کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وکذلک جعلناکم أمة وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا'' (البقرة: ۱۴۳)

کارِ دعوت کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرنِ اول ہی سے ہر دور میں علماء کرام نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور دعوت کا کام انجام دیا ہے، جس کے نتیجے میں آج دنیا کے کونے کونے میں مسلمان موجود ہیں۔ ہر دور میں جو بھی وسائل میسر تھے ان کے ذریعہ دعوت کا کام کیا جاتا رہا۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں نئے نئے وسائل وذرائع ایجاد ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان وسائل کو استعمال کر کے دعوت کے کام کو ترقی دی جائے اور اسے مزید مؤثر بنایا جائے۔

مدارس سے وابستہ افراد چونکہ حاملین علوم شریعت ہوتے ہیں اس لیے ان کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اس کام کو ایک اہم فریضہ سمجھ کر ادا کریں اور اس کے لیے بہترین منصوبہ بندی کریں۔ جہاں تک دعوتی مواد کا تعلق ہے تو وہ مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل مضامین اور کتابوں میں موجود ہی ہے جیسے تفسیر قرآن اور کتب احادیث وغیرہ میں۔ اب مدارس کا اہم کام یہ ہے کہ فارغین مدارس کو اس کام کے لیے کس طرح تیار کیا جائے؟

موجودہ دور میں بعض مدارس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ دعوت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے، چنانچہ بعض مدارس میں دعوت کے شعبے ''معھد الدعوة'' اور ''کلیة الدعوة'' جیسے ناموں سے کھل رہے ہیں۔

اب ضرورت ہے کہ اس پر باہمی گفتگو اور منصوبہ بندی کی جائے کہ زبان، کلچر اور مواد وغیرہ کے تعلق سے فارغینِ مدارس کو کس طرح تیار کیا جائے تاکہ وہ اسلام کے پیغام کو جدید دور کی زبان اور جدید انداز اسلوب میں مدلل طور سے پیش کر سکیں۔

اس سلسلہ میں ایک تجویز یہ ہے کہ تمام مدارس اپنے نصاب تعلیم میں دعوت سے متعلق ایک مستقل مضمون داخل کریں جس میں دعوتی اسلوب اور طریقوں کو واضح کیا جائے۔ یہ مضمون خصوصاً آخری

جماعتوں (درجات) میں پڑھایا جائے، خواہ ہفتے میں چند ہی پیریڈ اس کے لیے رکھے جائیں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے دعوتی کام کی عملی مشق کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ وہ بآسانی دعوتی میدان میں کام کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی میڈیا کے جو نئے وسائل سامنے آرہے ہیں ان سے بھی فارغین مدارس کو واقف کرانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا بندوبست کیا جائے۔

● **ظفر احمد اثری**،لندن۔ای میل: asarizafar@hotmail.com

دعوت الی اللہ ایک دینی فریضہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلغوا عنی ولو آیة، ”چاہے ایک ہی آیت ہی کیوں نہ ہو، میری طرف سے لوگوں تک پہنچا دو“ (بخاری)۔ اسی لئے مدارس اسلامیہ کے فارغین کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اپنے اداروں سے فارغ ہو کر اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ دین کے علوم سے بہرہ مند ہونے کے بعد تو ان کی ذمہ داری پہلے سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کی تیاری میں نصاب تعلیم کا رول تو ہوتا ہی ہے اس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی اس کی تیاری میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ نصاب تعلیم کے رول کے ساتھ اہم بات یہ ہے کہ اساتذہ کرام کس انداز سے طلبہ کے ذہن کو کار دعوت کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ نصاب تعلیم کی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اگر اساتذہ، طلبہ کے ذہن کو اس کام کے لیے نہیں تیار کر رہے ہیں تو عمدہ سے عمدہ نصاب تعلیم بھی بے کار ہے اور اس بات کا جائزہ لینا کہ نصاب تعلیم، دعوت کے کن کن پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے ہندستان کے تمام مدارس میں دعوت کے جذبہ کو ابھارنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ چیز دیکھنے کو ملتی ہے کہ جب فارغین دعوت کے میدان میں آتے ہیں تو دعوت کو پیش کرنے کے انداز میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے، اس کی سب بڑی وجہ یہ ہوتی ہے مدارس اپنے اپنے طے شدہ منہج کے مطابق تعلیم وتربیت کا انتظام کرتے ہیں اور ان ہی مناہج کے جدا جدا ہونے کی وجہ سے دعوت کے طریقہ کار میں فرق آتا ہے۔ لیکن اس بات کو ضرور ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ایک داعی امت ہونے کی حیثیت سے جہاں بھی اس عظیم الشان کام میں اشتراک کی ضرورت ہو اسے اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آپس میں اتحاد اور اتفاق باقی رکھ کر ملت کے مشترکہ مسائل کو حل کر سکیں۔ اور اس اتحاد واتفاق کو باقی رکھنا اس پرآشوب دور میں ایک نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ اور اس اتحاد کو فروغ دینے کے لیے مدارس اسلامیہ کے آپس میں رابطہ کی کوئی سبیل پیدا کرنی چاہیے تاکہ ایک دوسرے کے دعوتی تجربات سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

نصاب تعلیم میں اس بات کی کمی ہوتی ہے کہ اس میں عملی تدابیر، پلان موجود نہیں ہوتے، اس لئے

یہ بات عیاں ہے کہ دعوت کی تیاری منصوبند طریقہ سے نہیں ہو پاتی۔اس لئے چند ایسے امور ہیں جن کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے،تب ہی جا کر کما حقہ دعوت کی تیاری میں کامیابی ہوسکتی ہے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔صرف نصاب تعلیم پر انحصار کرنے سے اس کے تقاضے کو پورا کرنا ممکن نہ ہوسکے گا۔وہ چند باتیں یہ ہیں:

(۱) یہ بات واضح ہے کہ جتنا نصاب تعلیم ،دعوت کی تیاری کے لیے اہم ہے اتنا ہی اہم غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی ہے۔ چونکہ درسی کتابیں عملا ایک نظری وفکری مواد پر مشتمل ہوتی ہیں اس لئے غیر درسی کتابوں کا مطالعہ ،خصوصیت کے ساتھ سیرت رسول کا تفصیلی مطالعہ ،سیرت صحابہ، سیرت صحابیات،تاریخ اسلام،تمام ادیان کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔ان کتابوں کے مطالعہ سے دعوت کے جذبے کو مہمیز ملے گی۔اور ذہنوں میں دعوت کا ایک نقشہ اورخاکہ تیار ہوسکتا ہے۔

(۲) دین کا جامع اور مکمل تصور سمجھنا ضروری ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور رسول اللہ کی زندگی سے ثابت ہے اس لئے کہ مکمل دعوت جو کتاب وسنت سے مطلوب ہے اسے اس وقت تک پیش کرنا ممکن نہیں ہے جب تک دین کا جامع تصور نہ سمجھ لیا گیا ہو، دین کے صرف چند اجزاء کی تعلیم کے بعد دعوت کا ناقص تصور ہی پیش کیا جا سکے گا۔

(۳) جس ملک میں دعوت کا کام کیا جائے وہاں کے روزمرہ کے حالات اور وہاں کی اجتماعی، سیاسی اور معاشی صورتحال سے واقفیت، ملک کے سیاسی ڈھانچہ کو جاننا، ملک کے دستور کو سمجھنا، غرضیکہ ملک کو ہر پہلو اور ہر اعتبار سے سمجھنا اور جاننا دعوت کے کام کو انجام دینے کے لیے بہت ضروری ہے۔ کار نبوت سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت کے نظام سے پوری طرح واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ کار نبوت سے پہلے ملک کے سماجی اور رفاہی کاموں کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے، آپ حلف الفضول میں شریک ہوئے جس کا قیام عدل وانصاف اور سوشل جسٹس کی بنیاد پر تھا اور جس سے اجتماعی تکافل اور معاشی استحکام مقصود تھا ،اس میں اپنی شرکت کے بارے میں آپ نے فرمایا ”میں ایسے معاہدے میں شریک ہوا اگر مجھے سرخ اونٹ بھی اس کے بدلے ملتے تو اسے چھوڑ کر انہیں قبول نہ کرتا اور اگر دور اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا" (ابن ھشام) اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نبوت سے قبل آپ ملکی حالات اور وہاں کی سیاست سے بخوبی واقف تھے اور واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی اور رفاہی تنظیم کے ساتھ شریک ہو کر ملک وقوم کی خدمت انجام دینے لگ گئے تھے، اور کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔جس وقت آپ اس اصلاحی کمیٹی میں شریک ہوئے آپ کی عمر ۲۰ سال کی تھی، اور آپ کو نبوت ۴۰ سال کی عمر میں ملی تھی اس سے

اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا ایک عظیم الشان کام کی تیاری کتنی کم عمری سے شروع ہوگئی تھی۔

(۴) مشنری تحریکوں کا مطالعہ خصوصی طور پر کیا جائے کہ وہ اپنے ذرائع ووسائل کیسے استعمال کرتے ہیں اور کس طرح تبلیغ کا کام کرتے ہیں اور ان کا کیا طریقہ کار ہوتا ہے۔

(۵) اساطین مستشرقین نے جو کتاب وسنت پر رکیک حملے کیے ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے تا کہ ان کی طرف سے جو اعتراضات اور شکوک وشبہات اٹھائے گئے ہیں انہیں معلوم کر کے ان کا مدلل جواب معلوم کیا جائے، مستشرقین کی زہرافشانیوں سے متأثر ان تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے جن سے مسلمان مفکرین استفادہ کرتے ہوئے ان کے حق میں اپنی آواز ملاتے ہیں یا پھر اسلام اور کتاب وسنت سے ناواقفیت کی بنیاد پر ان کے ہم زبان بن جاتے ہیں۔اور اسلام کو دفاعی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسی طرح ملک کے اندر آئے دین اسلام اور شریعت اسلامیہ پر اٹھنے والے اعتراضات کی فہرست تیار کی جائے اور ان کا جواب تیار کیا جائے۔

(۶) عالم اسلام میں ماضی اور حال کی اسلامی تحریکوں کا معروضی اور تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔اسی طرح غیر اسلامی تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا جائے جن کے نظریات کی بنیاد پر دنیا میں سیاسی اور معاشی نظاموں کا دور دورہ ہے۔

(۷) ماضی اور حال میں ہندستان میں ہمارے اسلاف نے جو دعوت واصلاح کی تحریکیں چلائیں اور تبلیغ کا جو طریقہ اپنایا ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے طریقہ سے بھر پور استفادہ کیا جائے اور باریک بینی سے ان کا جائزہ لیا جائے۔

(۸) ملک کی قومی زبان اور علاقائی زبان کو جاننا اور سیکھنا بہت ہی اہم ہے اور اس کے ساتھ ہی رائج الوقت جو بین الاقوامی زبانیں ہیں انہیں سیکھنا دعوت کے لیے بہت مفید ہے تا کہ ان سے ملکی اور غیر ملکی حالات سے واقفیت اور دوسرے علوم وفنون سے آگہی ہو سکے اور فارغین ان کے ذریعہ موجودہ ٹکنالوجی کو استعمال کر کے دعوت کو بہترین انداز میں فروغ دے سکیں گے۔

(۹) تقریر وتحریر دعوت کے بہترین ذرائع میں سے ہیں، مدارس میں اس کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں، اس کی طرف اور خصوصی توجہ دینے سے اچھے سے اچھے مقررین اور لکھنے والے اس میدان کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔دعوت کے میدان میں اچھے لکھنے والوں کی سخت ضرورت ہے۔

(۱۰) فارغین کو ORGANIZATION SKILL کی تربیت دی جائے، اس اِسکل کی دعوت کے میدان میں سخت ضرورت پڑتی ہے اس سے دعوت کے کام کو پلان کرنے کی عادت ہوگی اور کم سے کم وقت میں بہتر طور پر دعوت کا کام انجام دیا جا سکتا ہے، اور یہ موضوع خالصتا اسلامی موضوع

ہے اور اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ ۔عربی زبان میں اس موضوع پر کتابیں موجود ہیں، اور مغرب کی زبانوں سے بھی عربی زبان میں ترجمے ہوئے ہیں۔لیکن اردو زبان میں اس موضوع پر کتاب ملنی مشکل ہے۔اور مغرب کی زبانوں میں، خاص طور سے انگریزی زبان میں کتابیں موجود ہیں۔یہ تو موضوع مغرب کا بن گیا ہے بلکہ یہ ان کی زندگی کا موضوع ہے۔مغرب میں تو اسے ایک فن کے طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔

● **نسیم احمد غازی فلاحی**،سکریٹری اسلامک ساہتیہ ٹرسٹ، نئی دہلی۔
موبائل نمبر: **9213134150**

دین کی دعوت عام بندگان خدا تک پہنچانا امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کی اولین ذمہ داری ہے۔اس ذمہ داری کو اس کے تقاضوں کے ساتھ پورا کرنے پر ہی مسلمانوں کی دنیوی واخروی کامیابی منحصر ہے۔اس کے سوا کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔قرآن مجید نے اس ذمہ داری کو ایک نہیں متعدد مقامات پر مختلف انداز اور مختلف پیرایوں میں واضح طور سے بیان کیا ہے، اور اسے فلاح وکامیابی کے لیے لازمی شرط قرار دیا ہے، قرآن کا صاف اعلان ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَـئِكَ هُـمُ الْـمُفْلِحُونَ۔ (آل عمران:۱۰۴) ''تمہیں ایک ایسی امت بن جانا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ۔ (آل عمران: ۱۱۰) ''تم بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی بھلائی وہدایت کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (فصلت:۳۳) ''اس سے اچھی بات (مشن ونصب العین) کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک وصالح عمل کرے اور کہے کہ میں فرماں بردار ہوں''۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ (الحج:۷۸) ''تاکہ رسول تمہارے سامنے حق کا گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کی گواہی پیش کرو''۔

کوئی شخص اگر قرآن مجید کے صرف ترجمے کو ہی سرسری طور پر پڑھے گا تو وہ یہ ضرور محسوس کرے گا کہ قرآن کا مرکزی مضمون اور اس کی پوری توجہ اس بات پر ہے کہ خدا کے بندے اس کے احکام سے واقف ہوں اور اس پر عمل پیرا ہو کر اپنی عاقبت سنواریں۔

قرآن نے اللہ کے پیغمبروں کے جو حالات بیان کیے ہیں، ان میں اس بات کے علاوہ اور کیا ہے کہ ان حضرات کی کوششیں ہی یہ تھیں کہ بندگان خدا اس کے دین سے واقف ہوں، جہنم کی آگ سے بچ جائیں اور اس کے سایہ رحمت میں آجائیں۔ اس کار عظیم کے لیے انبیاء کرام پریشانیاں اٹھاتے اور اپنا سب کچھ قربان کر دیتے۔ اللہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کار دعوت میں بے چینی اور بے قراری کو دیکھ کر قرآن میں متعدد بار کہا گیا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ (الشعراء:۳)

''کیا آپ اپنی جان کو ہلاک کر ڈالیں گے اس بات کے لیے کہ یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں''۔

رسول اللہؐ کے نزدیک اس کام کی کیا اہمیت تھی اور وہ اس کے لیے کس قدر متفکر تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار آپؐ کے قریب ترین ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ پر (وقت سے پہلے) ضعیفی کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں؟ نبیؐ نے جواب دیا کہ مجھے قرآن کی سورہ ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ قرآن کی سورہ ہود میں مختلف انبیاء کے واقعات وحالات بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے خدا کے دین کو قبول نہیں کیا اور اس کو نظر انداز کر دیا ان کو دنیا میں ہی تباہ کر دیا گیا، اور آخرت میں ان کے لیے عذاب الیم تیار ہے۔ نبی رحمت کو اس بات سے اتنی فکر لاحق ہوگئی تھی کہ اس کے اثرات آپؐ کی صحت پر نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ کیا آپؐ کی یہ فکرمندی، قلبی بے چینی اور بے قراری کسی غیر ضروری اور غیر اہم کام کے لیے ہوسکتی تھی۔

اوپر جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان کا صحیح طور پر ادراک اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ دینی مدارس سے وابستہ لوگ ہیں، اس لیے کہ ان حضرات کا دن رات کا مشغلہ ہی قرآن وحدیث اور علوم دینیہ کا مطالعہ کرنا اور کروانا ہے۔ مگر معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اس پہلو سے دینی مدارس کا رویہ نہایت مایوس کن رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے۔

ادھر کچھ سالوں سے ملک عزیز میں جو حالات پیدا ہوئے ہیں اس کی وجہ سے دینی مدارس کے اندر بھی کار دعوت کے سلسلے میں یقیناً کچھ نہ کچھ فکرمندی ضرور پیدا ہوئی ہے، لیکن کوئی قابل ذکر پیش قدمی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان حضرات کے سامنے کوئی عملی منصوبہ اور لائحہ عمل نہیں ہے کہ جس کو دیکھ کر وہ کام کی شروعات کر سکیں۔ اگر کوئی گروہ دعوتی کام کا عملی منصوبہ اور لائحہ عمل ترتیب دے کر دینی مدارس کو متوجہ کرے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے مدارس اس کا استقبال کریں گے اور اس کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔

دعوتی کام قولی اور عملی ہر دو پہلو سے ہونا چاہئے۔ جہاں تک قولی پہلو کی بات ہے تو اس میں علمی

کام اور علمی رہنمائی بہت ضروری ہے۔ مدعو قوم کی نفسیات، ان کے مذاہب اور رسوم کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، اور یہ کام بڑی قربانی چاہتا ہے۔ مدارس دینیہ شروع ہی سے اس پر توجہ کریں اور اپنے طلبہ کے اندر دعوتی تڑپ پیدا کر کے اور اس کی ضرورت کا احساس دلا کر انہیں اس کام کے لیے اپنے کو وقف کرنے پر آمادہ کریں۔ ظاہر ہے کہ تمام طلبہ تو اس کام کے لیے اپنے کو فارغ نہیں کر سکتے، البتہ کچھ لوگ اگر اس کے لیے آمادہ ہو جائیں تب بھی بڑی حد تک یہ کام ضرور ہو سکے گا۔

رہا اس کام کا عملی پہلو تو یہ نہ صرف مدارس دینیہ کے ذمہ داران اور فارغین کے لیے ضروری ہے بلکہ پوری امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عمل سے اسلام کی گواہی دے۔ مدارس میں دوران تعلیم طلبہ کو اس کی تربیت دی جائے، اور اس کی اہمیت وضرورت کا احساس دلایا جائے۔ نیز ہمارے اساتذہ اپنے عمل سے اس کا نمونہ پیش کریں۔

دینی مدارس کے ذمہ داران کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں، اگر وہ ان پر توجہ دے سکیں تو ان شاء اللہ دعوتی کام میں تیزی آئے گی اور اس کے خوش گوار نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے جا سکیں گے۔

معروف وقابل ذکر مدارس کے نمائندوں کو ایک مقام پر جمع کیا جائے جہاں اس بات پر غور ہو کہ کار دعوت کے سلسلے میں مدارس کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اپنے نصاب تعلیم میں اس پہلو سے انہیں کیا ترمیم کرنی ہے، اور کیا لائحہ عمل بنانا ہے۔ اس کام میں ہمارے فقہی وجزوی اختلافات کو مانع نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامی بنیادوں پر ہمارا اتحاد ہی ہماری کامیابی کی کنجی ہے۔ ہر مکتب فکر اور ہر مسلک کے علماء کو اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ اپنے فکری اور مسلکی اختلافات کو ان کے جائز حدود میں رکھیں اور عملاً اس بات کا ثبوت دیں کہ ہم سب ایک امت ہیں۔

ہم اپنے دینی تعلیمی اداروں میں طلبہ اور طالبات کی ایسی تعلیم وتربیت کا نظم کریں کہ ہمارا ماحول دعوتی ماحول بن جائے۔ مدارس کے فارغین کے ذہن میں اس حقیقت کو اچھی طرح پیوست کر دیا جائے کہ دنیا میں ہماری اصل ذمہ داری اور اصل کام بندگان خدا کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے، بقیہ سبھی کاموں کی حیثیت بالکل ثانوی ہے۔ ہمارے فارغین ملک وملت کی اصلاح وتعمیر میں نمایاں رول ادا کر سکیں۔ فارغین مدارس صحیح وحقیقی معنوں میں داعی ہوں جو برادران وطن کی مادری زبانوں سے واقفیت رکھتے ہوں اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر حکمت کے ساتھ ان کو دین حق سے روشناس کرا سکیں۔ فارغین کی زندگیاں مدعو کے لیے نمونہ ہوں اور ان کی ذات مدعو قوم کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں اگر دوران تعلیم اساتذہ کرام طلبہ کے اندر داعیانہ صفات قرآن وحدیث کی روشنی میں پیدا کرتے رہے ہیں۔

قرآن وحدیث کی تدریس کے دوران صرف لغوی اور فنی اور فقہی پہلوؤں پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ ان کی روح اور اصل مقصد سے بھی طلبہ کو واقف کرائیں، نیز حسب موقع انہیں عملی تربیت دیں۔ وقتاً فوقتاً دعوتی امور کے ماہرین کے لکچرس اور پروگرامس کا اہتمام کریں۔ غیر مسلم اہل علم اور ان کی مذہبی شخصیات کے علمی پروگرام حسب موقع رکھے جائیں، اور طلبہ کو ان کے مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ ان شاءاللہ اس کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔ مدارس اسلامیہ کے ماحول کو دعوتی بنانے کے لیے مندرجہ ذیل کام انجام دیئے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر مدارس کے اندر سمپوزیم اور سیمینارس منعقد کرکے ان میں قرب وجوار کے غیر مسلم بھائیوں کو شرکت کے لیے مدعو کرنا، بالخصوص اسکولوں اور کالجوں کے ذمہ داران، اساتذہ اور سینئر طلبہ کو دعوت دینا۔ بعض عنوانات پر تحریری مقابلے کرانا، اور ان میں غیر مسلم طلبہ کو بھی شرکت پر آمادہ کرنا۔ طبی اور میڈیکل کیمپ کا انعقاد کرنا، اور ان میں غیر مسلم بھائیوں سے بھی استفادہ کا موقع فراہم کرنا۔ مدارس کے آس پاس برادران وطن کی آبادیوں اور محلوں میں پروگرامس منعقد کرنا، جس میں سماجی برائیوں مثلاً شراب نوشی، سود، بے حیائی، دھوکہ دھڑی، بدعنوانی، عورتوں پر مظالم اور ان جیسے دیگر مسائل پر گفتگو کی جائے جن مسائل سے آج مسلم اور غیر مسلم سب دوچار ہیں۔ ان پروگرامس میں مدارس کے اساتذہ و بڑے طلبہ ضرور شرکت کریں۔ نیز ان میں خواتین کو بھی مدعو کیا جائے۔

یہ امور بالواسطہ طور پر فارغین مدارس کے اندر داعیانہ ذوق وشوق اور داعیانہ کردار پیدا کرنے میں نہایت مؤثر ثابت ہوں گے۔ آخر میں بس اتنا عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ جب اور جس وقت بھی ہمارے مدارس دعوتی کام انجام دینے کے لیے سنجیدہ ہوکر کوششیں شروع کردیں گے، ان شاءاللہ اس کام کی راہیں ان پر کھلنا شروع ہوجائیں گی۔

● **عبدالحلیم فلاحی**، مدھر سندیش سنگم، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر: 9718597980

ہندوستان کے تناظر میں اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو دعوتِ اسلامی کا فروغ ہی مدارسِ اسلامیہ کی تاسیس اور قیام کی حتمی غرض وغایت اور مقصد وحید قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ملک کی آبادی کا بڑا حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو دینِ اسلام کی حقیقت اور اس کی بنیادی تعلیمات سے بالکل بے بہرہ اور قطعی ناآشنا ہیں۔ یقیناً ہمارے بانیانِ مدارس اسلامیہ کے پیش نظر جہاں یہ بات رہی ہوگی کہ ان مدارس میں طلبہ عزیز کو علوم دینیہ اور فنونِ اسلامیہ سے آراستہ کیا جائے وہیں دعوتِ اسلامی کا فروغ اور

اسلام کی نشر واشاعت کے لیے طلبہ کو تیار کرنے کا مقصد ہرگز ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔ کیونکہ مخلص داعیانِ اسلام کی تیاری ہمارے ملک کے ہندوستان کی شدید ترین ضرورت اور ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ ہمارے علماء کرام کو بیک وقت ملتِ اسلامیہ کے افراد کی اصلاح اور ان کی دینی تربیت کرنی ہے اور برادارانِ وطن کو اسلام کے چشمۂ صافی وشافی سے سیراب بھی کرنا ہے۔

داعیانِ اسلام کی تیاری کے تعلق سے جب ہم مدارسِ اسلامیہ کے ماضی وحال کی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف طور پر یہ تلخ حقیقت ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے کہ مدارسِ اسلامیہ نے فقہ واصول فقہ، حدیث وعلومِ حدیث اور تفسیر وعلومِ تفسیر کے ماہرین تو پیدا کیے مگر داعی خال خال نظر آتے ہیں۔ ان مدارس میں مناظر اور فقہی موشگافیوں کے ماہر تو پیدا ہوئے لیکن وہ وراثتِ انبیاء (کارِ دعوت) کے حقیقی وارث نہ بن سکے۔ ہمیں مدارسِ اسلامیہ میں ایسے لوگ بکثرت دکھائی دیتے ہیں جو دوسرے مسالک پر اپنے مسلک کی برتری ثابت کرنے میں مہارتِ تامہ کے ساتھ دعوت مُبارزت دیتے رہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جن کا سینہ کارِ دعوت کی انجام دہی کے جذبے سے معمور ہو، کم دکھائی دیتے ہیں۔

مدارس اسلامیہ کی اس افسوسناک صورت حال سے متعلق محدث جلیل حضرت انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کا یہ واقعہ بڑا فکر انگیز ہے: واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حضرت اپنے حجرے میں مغموم بیٹھے تھے کہ یکا یک ان کے ایک عقیدت مند کمرے میں آ گئے اور حضرت کو اس حال میں دیکھ کر بے حد پریشان ہوئے اور فوراً سوال کیا، خیر تو ہے۔ یہ آج آپ کی حالت کیسی ہے؟ حضرت نے جواب دیا: ’’ایک بات کے لیے سخت افسوس میں مبتلا ہوں، اس لیے یہ حالت ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ پوری زندگی مسلک حنفی کی برتری ثابت کرنے میں گزار دی اور اسلام کی دعوت کا کام نہ کر سکا جو فرض عین تھا‘‘۔

حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا یہ تأسف ہمارے لیے مہمیز کا کام کر رہا ہے۔ حضرت کا یہ درد انگیز تأسف ذمہ دارانِ مدارس سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مدرسوں کے نصاب تعلیم کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور از سرِ نو ترجیحات کا تعین کریں۔ اور ترجیحی بنیادوں پر دعوتِ اسلامی سے متعلق موادومو ضوعات کو اپنے نصابِ تعلیم کا اہم اور ناگزیر جزو بنائیں۔ اسی صورت میں ہم مدارسِ اسلامیہ کے فارغین کو کارِ دعوت کے لیے میدانِ عمل میں اتار سکیں گے۔

مدارس اسلامیہ سے فارغ ہوئے طلبہ کو دعوت اسلامی سے متعلق موادوموضوعات کا درس دینے کے ساتھ ساتھ ایک اہم اور انتہائی ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے مدارس کی عمومی فضا کافی حد تک کارِ دعوت کی تیاری کے سازگار ہو۔ ذمہ دارانِ مدارس اور اساتذۂ کرام کا مزاج خالصتاً داعیانہ ہو۔ خاص طور ہمارے اساتذۂ کرام فکری وملی دونوں اعتبار سے طلبہ کے لیے ایک مثالی داعی ہوں اور موقع بہ موقع طلبہ کے سامنے دعوتِ اسلامی کی

اہمیت اجاگر کرتے رہیں۔اگرایسا ہوگا توان شاءاللہ ہمارے طلبائے عزیزاپنے اپنے مدرسوں سے ایک مثالی باکردارداعی بن کرفارغ ہوں گےاوران کے سینے جذبۂ دعوت سے سرشار ہوں گے۔

لیکن آج کے اس دور میں ہمارے مدارسِ اسلامیہ کی عمومی فضا کا جومنظر نامہ ہمارے سامنے ہے وہ انتہائی کرب ناک اور دردناک ہے۔شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہو جہاں اساتذہ، اساتذہ کے درمیان اور اساتذہ اورانتظامیہ کے درمیان چپقلش نہ ہو، بلکہ اساتذہ کے درمیان گروپنگ اور گروہ بندیوں کا تذکرہ ہر مدرسے کے بارے میں ملتا ہے۔اورطرفہ یہ کہ بعض دفعہ یہ گروہ بندیاں اتنی شدت اختیار کر جاتی ہیں کہ ہمارے اساتذۂ کرام طلباءِ عزیز کے ذہنوں کومسموم کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ بسااوقات شعوری یاغیرشعوری طور پرکلاسوں کے اندراپنے اپنے مضامین پڑھاتے وقت بھی اپنے مخالف استاذ یاگروپ کے خلاف لب کشائی کرتے رہتے ہیں۔ایسی مسموم فضا میں داعیِ اسلام توکجا گروپنگ کے دلدادہ ہمارے مدارس سے فارغ ہوکرنکلیں گے۔آج ملت اسلامیہ ہند کا انتشاراور روزافزوں گروہ بندیاں اس کا بین ثبوت ہیں۔میں شاعرِ اسلام علامہ اقبالؒ کے اس شعرا پنی گفتگوختم کررہاہوں ؂

شمعِ محفل ہو کے جب تو سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس محفل سے بے گانے رہے

● **نعیم احمد غازی فلاحی،** رکن شوری انجمن طلبہ قدیم وجامعۃ الفلاح،
موبائیل نمبر: **9810156757**

اس شمارے کا خصوصی موضوع ہے’ کاردعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری‘۔اس میں سب سے پہلے سوال آتا ہے کہ دعوت دین کیا ہے، اور یہ کام امت کے لیے کس درجہ اہمیت رکھتا ہے۔قرآن مجید اور حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت دین امت مسلمہ کا بنیادی مشن ہے، یہ امت اللہ رب العزت کی جانب سے اس بات پر مامور کی گئی ہے کہ وہ بندگان خدا کو اسلام کے پیغام سے روشناس کرائے۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت محمدؐ نبی آخرالزماں ہیں، ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔اس لیے حضور اکرمؐ کے بعد بندگان خدا تک رب کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔کارِدعوت ایک انبیائی مشن ہے جس کے لیے امت مسلمہ کے ہرفرد کو ذمہ دار بنایا گیا ہے۔دعوت دین امت مسلمہ کا فرض منصبی بھی ہے اوران کا مقصد وجود بھی۔اس میں علماء کا کرداراس لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ قرآن وسنت کی تعلیم وتعلم جیسے اہم شعبے سے وابستہ ہیں، وہ حاملین شریعت بھی ہیں اور شریعت اسلامی کے اسرار ورموز سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واقفیت بھی رکھتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان پر نئی

نسلوں کی ذہنی آبیاری اور علوم شریعت اسلامیہ سے لوگوں کو روشناس کرانے کی اہم ترین ذمہ داری بھی ہے۔ اسی لیے علماء کو ورثۃ الانبیاء کہا گیا ہے۔ ملک کی موجودہ صورتحال، عالمی و ملکی سطح پر ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل اور چیلنجز کا اگر عمومی جائزہ لیا جائے اور داعیانہ مشن رکھنے والی امت مسلمہ کا بالعموم اور علماء دین اور حاملین شریعت کے کردار کا بالخصوص تجزیہ کیا جائے تو بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امت مسلمہ اس سلسلے میں تشویشناک حد تک غفلت کا شکار ہے، اور بحیثیت مجموعی اس مشن سے کوسوں دور جا پڑی ہے۔

جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے، بلاخوف لومۃ لائم یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی بھی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس نے بحیثیت مجموعی دعوت دین کو اپنا مشن اور نصب العین بنایا ہو، اور اس انبیائی مشن کے لیے افراد سازی اور علمی و عملی تربیت ان کے نصاب تعلیم کا اہم جزو ہو۔ ملک کے طول وعرض میں پائے جانے والے مدارس پہ ایک عمومی نظر ڈالیے تو دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، جہاں تک ممتاز و معروف مدارس، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مظاہر العلوم دیوبند، مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کا تعلق ہے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی اختصاص ہے۔ کسی نہ کسی فیلڈ میں یہ مدارس اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، لیکن ان میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا مشن اور نصب العین کلی طور پر دعوت دین ہو۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ میں ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کی اہمیت اور ان کی افادیت کا منکر نہیں ہوں۔ میں آج بھی بجا طور پر مدارس کو دین کے قلعے اور مدارس کے اساتذہ اور مربیوں کو اللہ کے بے لوث سپاہی سمجھتا ہوں، جو نہایت سخت حالات میں تحفظ دین کے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تلخ حقیقت بھی ہمیں پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہماری دفاعی لائن خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، پے بہ پے حملوں سے اس کے بکھر جانے کا خطرہ بہرحال رہتا ہے۔ ملت اسلامیہ کے تحفظ و بقا کے لیے دفاع کے ساتھ اقدام بھی ضروری ہے۔ اقدام سے مراد خدانخواستہ کسی پر حملہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے خلاف ہونے والی سازشوں، غلط فہمیوں اور برادران وطن کے ذہن و دل میں پائے جانے والے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے انہیں اسلام سے متعارف کرانا، اور انہیں اسلام کے حقیقی پیغام سے اپنے علم اور عمل کے ذریعہ روشناس کرانے کی ضرورت ہے، یہی حکمت عملی ہے جس کا مدارس اسلامیہ میں فقدان ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ذمہ داران مدارس کو اس کاز کی اہمیت کا احساس ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کیا؟ یا وہ کون سے موانع ہیں جن کی وجہ سے وہ مدارس کے طلبہ کے اندر برادران وطن تک حق کی دعوت دینے کی اسپرٹ نہیں پیدا کر پا رہے ہیں، بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس انبیائی مشن کے لیے مدارس اسلامیہ میں کوئی علمی تیاری ہے نہ کوئی جامع منصوبہ بندی۔

اس وقت ملت اسلامیہ ہند مختلف مسائل اور چیلنجز سے دوچار ہے، اس کے تعلق سے ملک کے

اکثریتی طبقے کے درمیان طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جس کے نتیجے میں ملت کو بعض اوقات کافی سخت حالات سے بھی دوچار ہونا پڑ جاتا ہے، فرقہ ورانہ سوچ اور فکر بہت تیزی کے ساتھ ہندوستانی سماج میں اپنے قدم جمارہی ہے۔ ان تمام مسائل اور چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے دعوت دین ایک بہترین ذریعہ ہوسکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کے لیے یہی ایک ذریعہ ہے، اس سے نہ صرف اس امت کی آخرت سنورے گی، بلکہ اس کے متعلق سماج کے اکثریتی طبقے کی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوگا، اور تعلقات میں جو خلیج پائی جاتی ہے، وہ بھی کسی نہ کسی حد تک کم ہوگی۔ لیکن اس کے لیے امت مسلمہ کے نوجوانوں اور طلبہ کو دعوت دین کے مشن پر لگنا ہوگا، اس کے لیے ہم کو بالکل ویسے ہی مارکیٹنگ کرنی ہوگی، جیسے دوسرے بزنس مین اپنے بزنس اور تجارت کے لیے مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالی نے خدا اور رسول پر ایمان، اور اپنی جان و مال سے اس کی راہ میں کوشش کو تجارت قرار دیا ہے، جس کے عوض وہ نہ صرف دردناک عذاب سے نجات دے گا، بلکہ دنیا میں ہمیں اس کی مدد و نصرت اور فلاح وکامرانی حاصل ہوگی۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے پروڈکٹ لے کر ملک کے عوام تک پہنچیں، اور انہیں بتائیں کہ دین اسلام کیا ہے، اور ان الزامات کی حقیقت کیا ہے جو اسلام پر تھوپے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ظاہر ہے ہمیں اپنے تنگ دائروں اور علیحدہ بستیوں سے نکلنا ہوگا، ہمیں برادران وطن کے درمیان جانا ہوگا، ان سے تعلقات کو بہتر اور مضبوط بنانا ہوگا، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوگا، اور ان کے ساتھ دکھ درد اور خوشی کے مواقع پر شریک ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے ہمیں اپنی سوچ اور مزاج کو بدلنا ہوگا، خدمت خلق کو اپنا شیوہ بنانا ہوگا۔ محتاج، غریب، کمزور اور پریشان حال خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم سب کا خیال رکھنا ہوگا، سب کی خدمت کرنی ہوگی۔ عید بقرعید کے موقعوں پر ان کو اپنے یہاں دعوت دینی ہوگی، ان کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کرنا ہوں گے۔ کسی مصیبت کے وقت جب ریلیف ورک کرنے کے لیے نکلیں تو بلاتفریق مذہب وملت سب کی خدمت کرنی ہوگی اور سب کا خیال رکھنا ہوگا۔

جہاں تک اس کام کے لیے طلبہ اور فارغین مدارس کی تیاری کا مسئلہ ہے تو سب سے پہلی بات یہ کہ اساتذہ اور ذمہ داران مدارس کو اپنے سوچنے اور سمجھنے کا انداز بدلنا ہوگا۔ ابھی صورتحال یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ ہند مسجدوں کی امامت، مکاتب اور مدارس میں تدریس اور کچھ حد تک بیرون ملک روزگار کے لیے افراد تیار کرر ہے ہیں، اس کے لیے مدارس کی ذہن سازی کرنے کی ضرورت ہے۔ مدارس کی سوچ میں فرق آئے گا، تو اسی کے ساتھ ساتھ طلبہ اور فارغین مدارس کی سوچ میں بھی تبدیلی واقع ہوگی۔ اس طرح پہلا کام سوچ اور ذہن کی تبدیلی کا مسئلہ ہے۔

دوسری چیز طلبہ اور اساتذہ کی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ ان کی دعوتی تیاری کی ضرورت ہے، اور

دعوتی تیاری کے لیے سب سے ضروری چیز مدعو کی زبان، اور مدعو کے حالات سے واقفیت ہے۔ مدارس اپنے طلبہ کے اندر ہندوستانی زبان اور ہندوستانی مذاہب اور کلچر سے گہری واقفیت پیدا کریں۔ اس کے بغیر دعوتی کام میں کافی دشواریاں پیش آتی ہیں اور یہ دشواریاں بسا اوقات خود دعوت دین کے لیے نقصاندہ ثابت ہوجاتی ہیں، لہذا ضروری ہے کہ اس پہلو سے داعیانِ دین کی تیاری کرائی جائے۔

قولی دعوت ایک چیز ہے اور عملی دعوت ایک دوسری چیز ہے۔ مدارس کے لیے جہاں یہ بات اہم ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو قولی دعوت کے لیے تیار کریں، ان کی علمی وفکری تیاری کرائیں، وہیں ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو عملی دعوت کے لیے بھی تیار کریں۔ جس طرح مارکیٹنگ کرنے والے اپنی پروڈکٹ کا ڈیمو پیش کرتے ہیں، اس کی افادیت کو بتاتے ہیں، اس کو استعمال کرکے اس کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں اسلام کے داعی تیار کرنے ہوں گے جو اپنے عمل سے، اپنے علم سے، اپنے اخلاق اور اپنے کردار سے اسلام کا حقیقی نمونہ ہوں، جو اسلام کی چلتی پھرتی تصویر ہوں، جنہیں دیکھ کر لوگ اسلام کی طرف راغب ہوں۔ ان کے اندر مشنری صفات پیدا کرنی ہوں گی۔ ان کے اندر قرن اول کا سا جوش جنوں اور اسلاف کا سا حسن کردار اور حسن اخلاق پیدا کرنا ہوگا۔ یوں بھی ایک مسلمان کو اسلام کا نمونہ ہونا چاہیے اور دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ان کا عمل، ان کا کردار اور ان کا اخلاق اسلام کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

جب مدارس کی بات ہوتی ہے تو خود بخود بات نصاب تعلیم تک پہنچتی ہے، مدارس کے نصاب تعلیم کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نصاب تعلیم میں دعوت دین اور اس کے لیے تیاری سے متعلق مواد اور مضامین کم سے کم، بلکہ نہیں کے برابر ہیں۔ ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم میں جہاں قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے تمام مضامین کی تعلیم دی جائے، وہیں کچھ دعوتی موضوعات اور مضامین بھی رکھے جائیں۔ ایک مسئلہ زبان کا بھی ہے، شمالی ہند کی زبان ہندی ہے، جبکہ مدارس اسلامیہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کے مدارس میں ہندی زبان کی تعلیم حد درجہ کمزور ہے، اس کو متوازن انداز میں لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔ جامعۃ الفلاح نے اس سلسلے میں ابتدائی پیش رفت کی ہے، اسے مزید مربوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دیگر مدارس بھی اس سے استفادہ کریں، اور علماء حقیقی معنوں میں انبیاء کے وارث بن سکیں۔

آخری بات یہ کہ سب کچھ کے ساتھ مدارس کے عمومی ماحول کو دعوت دین کے لیے سازگار بنانے کی ضرورت ہے، دعوتی مزاج، دعوتی حکمت اور دعوتی رویہ اور دعوتی اپروچ داعی کے لیے بہت ہی اہم اور ضروری ہیں۔ ہمارا مزاج دعوتی ہو، ہماری سرگرمیوں میں دعوتی حکمت کا مظاہرہ ہو، اور ہمارے

رویوں اور اپروچ میں ہمیشہ ایک داعیانہ تڑپ اور داعیانہ کردار نظر آئے۔

● **عبدالقوی فلاحی صدیقی،** اورنگ آباد (معاون ناظم مجلس العلماء تحریک اسلامی مہاراشٹر)، موبائیل نمبر: 9422712060

دعوت دین امت مسلمہ پر عائد کردہ فریضہ ہے۔ سارے انسانوں کے درمیان سے اس امت کا انتخاب اس مہتم بالشان فریضہ کی ادائیگی کے لیے کیا گیا ہے۔ متعدد قرآنی آیات اور نبوی فرمودات سے اس کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔

۱)ولتكن منكم امت الخ

۲)ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنه

۳)ومن احسن قولا ممن دعاالى الله الخ

پہلی آیت میں اس فریضہ کا بیان ہے کہ امت کی تشکیل کی غایت دعوت ہے۔ اس آیت کریمہ میں "منکم" کے "من" کو بعض حضرات نے تبعیض کا لیا ہے جو کہ درست نہیں ہے، "مِنْ" بیانیہ ہے۔ پھر اس آیت کے آخر میں، اس فریضہ کے ادا کرنے والوں کے لیے فلاح کی ضمانت دی گئی ہے، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ "مِنْ" بیانیہ ہے تبعیضیہ نہیں، کیونکہ فلاح کا حصول ہر بندۂ مومن کی ضرورت ہے اور اس کو یہاں دعوت الی الخیر سے ملزوم کیا گیا ہے۔

ادع الی سبیل ربک۔ فعل امر، فرضیت پر دلالت کرتا ہے۔ احسن الاقوال، دعوت الی اللہ کو قرار دیا جانا اور پھر دفاع بالاحسن کا حکم بھی دعوت کی فرضیت کو ہی کو واضح کرتا ہے۔

بلغوا عنى ولو آية

اَلَا فَليبلغ الشاهد الغائب

اَلَا هل بلغت ...

اللهم اشهد

ان نبوی فرمودات سے بھی دعوت کی فرضیت واضح ہوتی ہے، سر دست دعوت اور تبلیغ میں پایا جانے والا فرق ہماری گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔ دعوتِ دین کی فرضیت کے واضح ہو جانے کے بعد راست ہم اس پہلو سے اس موضوع پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ "فارغین مدارس" کی اس فریضہ کے لئے تیاری کے حوالے سے کن امور کو پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے۔

دعوت دین کا، علماء یا فارغین مدارس کے ساتھ اختصاص، بوجہ وارثین انبیاء ہونے کے ہے۔ اس

سے یہ بات ازخود واضح ہوجاتی ہے کہ انبیاءؑ داعیان دین ہونے کی حیثیت سے جن بنیادی اوصاف سے متصف اور کردار کے حامل تھے ان اوصاف وکردار کے بغیر فریضہ دعوت کی ادائیگی ممکن نہیں ہے۔ ان اوصاف کو اجمالاً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱) خدا کی ذات پر کامل یقین ۲) دین خداوندی کے واحد برحق دین ہونے کا کامل یقین ۳) دعوت دین کی فرضیت کا احساس وادراک ۴) اس فریضہ کی ادائیگی ہی کے موجب فلاح ہونے کا یقین ۵) راہ دعوت کی مشکلات کا اندازہ اور ان مصائب ومسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ۶) کاردعوت میں للّٰہیت وخلوص ۷) کاردعوت کے لیے انفاق، جان مال، وقت، صلاحیت وزندگی، غرض تمام چیزوں کے لگادینے کی کیفیت ۸) مدعو کے تئیں ہمدردی وخیر خواہی کی بے لوث کیفیت ۹) کارِدعوت، اثراتِ دعوت، نصرتِ دعوت، قبولیتِ دعوت، اور مدعو کے لیے دعاؤں کا اہتمام۔

ان بنیادی اوصاف کو داعی کے کردار کے اجزاء لاینفک کی حیثیت حاصل ہے اور ان کی حیثیت لازمی صفات کی ہے، جن سے ہر داعی کو متصف ہونا، بہرصورت ضروری ہے۔ تغیر پذیر حالات میں فریضہ دعوت کی ادائیگی کے لیے فارغین مدارس کی تیاری کے حوالے سے جن امور کو مہمات الامور کی حیثیت سے پیش نظر رکھنا ضروری ہے ان کی فہرست طویل ہوسکتی ہے۔ جس کے ذکر کا شاید یہاں محل اور موقع نہیں ہے۔ چند ایک نکات جو زیرغور لائے جانے چاہئیں، وہ اس طرح ہیں:

۱) ہندوستان کا دعوتی منظر نامہ اضداد کا مجموعہ بھی ہے اور متنوعات کی آماج گاہ بھی، اس منظر نامہ کے حوالے سے اس میں کام کرنے والے داعیان دین کی اس سے واقفیت اور اس کے تنوعات واضداد کا گہرا علم ضروری ہے۔ اعتقادی، فکری، لسانی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، علاقائی وجغرافیائی تنوعات وتغیرات جو کہیں اضداد کی صورت بھی اختیار کرلیتے ہیں ان کے علم کے بغیر، دعوت کے فریضہ کی ادائیگی ممکن نہیں۔ اس ملک میں کہیں کوئی مزعومہ ہستی معبود ہے، تو وہی ہستی ملک کے کسی دوسرے حصہ میں مردود، اور قابل نفرت ہے۔ مدعو کے سلسلے میں اس طرح کے تمام امور سے داعی کو پوری طرح واقف ہونا ضروری ہے ورنہ اس سے عدم واقفیت اس کے لیے مسائل پیدا کرسکتی ہے۔

۲) یہاں کا مدعو سماج اپنے معتقدات کی بنیاد پر منقسم ہے، ان میں پائے جانے والے طبقاتی نظام (ورن ویوستھا) کو مذہبی استناد حاصل ہے، اور اس کی بنیاد پر کوئی اعلی، اشرف، افضل تو کوئی ادنی، کمتر وارذل ہے، اس مذہبی طبقاتی نظام، اس کی خباثتوں، اس کے پیدا کردہ مسائل ومعائب کا بھرپور علم داعی کو ہونا چاہیے۔ اس سے کماحقہ واقفیت کے بغیر اگر داعی برہمن اور شودر کو ایک ہی طرح سے، ایک ہی دعوتی مواد (Content) ایک طرز تخاطب، ایک ہی طرز استدلال سے مخاطب کرے گا تو یہ

اس حکمت کے خلاف ہوگا جو کار دعوت میں داعی کو ملحوظ رکھنی ہے، ایک اعلی ذات کا مدعومختلف ذہنی کیفیات کے ساتھ جیتا ہے اور ایک ادنی ذات کے مدعو کی ذہنی حصار بندیاں الگ ہوتی ہیں۔ دونوں کے درمیان، نفسیاتی، جذباتی، حسیاتی فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں کا فکری ونظری مستوی بھی یکساں نہیں ہوتا، دونوں ہی کے انفرادی واجتماعی زندگی جینے کے اسلوب وانداز مختلف ہوتے ہیں۔ ان سارے امور کا علم اور اپنی دعوت میں ان کو ملحوظ رکھنا داعی کے لیے از حد ضروری ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ الـذین استکبر وا اور الذین استضعفوا، الملأ من القوم ۔اور الأرذلون کے انطبا ق اور اس مناسبت سے دعوت کی حکمت و Strategy داعیانہ کردار کی ضرورت ہے۔ داعی کی اس پہلو سے تیاری فریضہ دعوت کی ادائیگی کے لیے لازم ہے۔

۳) لسانی تنوعات: ہندوستان کثیر آبادی اور وسیع رقبہ والا ایک عظیم ملک ہے۔ یہاں کے مختلف علاقوں، صوبوں اور ریاستوں میں لوگوں کی زبانیں مختلف ہیں۔ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ میں مدعو کی لسانی ضرورت کا خیال رکھ کر، انسانوں کی رشد وہدایت کے خدائی اہتمام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان LINGUISTIC BARRIER (لسانی حجابات) نہ پائے جائیں، ہندوستانی دعوتی منظر نامہ کی ضرورت ہے کہ یہاں داعیوں کی تیاری میں اس بات کو بہت زیادہ ملحوظ رکھا جائے کہ داعی، مدعو کی زبان میں اس سے کلام کرنے کی بھرپور استعداد کا مالک ہو۔ ایک شخص کو اپنی زبان میں مخاطب بنانے اور کسی دوسری زبان میں اس سے گفتگو کرنے کے حاصلات پر غور کیا جائے تو نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ مدعو کی زبان، لفظیات واصطلاحات، لسانی وادبی پیرایہ بیان کا لحاظ رکھ کر جب اس کو مخاطب بنایا جاتا ہے تو افہام وتفہیم کے عمل کی سرعت کے علاوہ ایک طرح کی جذباتی انسیت اور دل کی دنیا میں انقلاب کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں جب داعی علاقہ کی زبان، یعنی مراٹھی میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں تو ان کے انہماک واستغراق کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے اپنی زبان کے تیئں قلبی تعلق، جو کبھی ان کو لسانی عصبیت میں مبتلا کرتا ہے، اس صورت میں بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ ان امور کو ملحوظ رکھ کر داعیان دین کو ان علاقائی اور صوبائی زبانوں کو سیکھنا ضروری ہے جن علاقوں کو وہ اپنے کار دعوت کے لئے منتخب کرنے والے ہیں۔

مندرجہ بالا اہم ترین نکات کو پیش نظر رکھ کر ارباب مدارس اپنے تعلیمی نصاب اور تربیتی وتدریبی پروگرام میں کچھ اہم تبدیلیوں کی طرف توجہ دیں تا کہ متخرجین مدارس، جب کار دعوت کی انجام دہی کے لیے میدان دعوت میں آئیں تو وہ کسی پہلو سے کمزور نہ ہوں۔

۱) ہندوستان تہذیبوں اور ثقافتوں کا تعارف، تجزیہ اور تنقیدی مطالعہ، ان عناوین کو احاطہ کرنے

والی کتب کا مطالعہ اور توسیعی خطبات کا اہتمام۔

۲) یہاں کے مختلف علاقوں میں آباد برادران وطن کی عمومی کیفیات، مثلاً ان کے معتقدات، افکار ونظریات، رسوم اور رواج کا مطالعہ، اور تنقیدی تجزیہ۔

۳) طبقاتی نظام، اس کی تاریخ، اس کے اثرات، مفاسد وعواقب وغیرہ کی مکمل معلومات۔

۴) تقابل ادیان: ادیان، تاریخ ادیان، اساسات وتعلیماتِ ادیان وغیرہ کا مطالعہ وناقدانہ تجزیہ۔

۵) ہندوستان علاقائی زبانوں کی تدریس کا نظم۔ اہل مدارس کو اس جانب خصوصی توجہ مبذول کرنی ہوگی۔ ہمارے یہاں کچھ مدارس علاقائی ہوتے ہیں اور کچھ بڑے مدارس وجامعات کی حیثیت ملکی سطح کی ہے۔ ہر دو صورت میں نصاب تعلیم کی تدوین میں اس بات کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا جانا چاہیے کہ مدعو کی کسی ایک زبان کو اہتمام کے ساتھ اس طرح پڑھایا وسکھایا جائے کہ اس زبان میں کلام، اور گفتگو کی مہارت پیدا ہو جائے اس کے لیے اگر ایسے مضمون کو جواب مدارس میں بس برکت کے طور پر پڑھایا جاتا ہے اور طرز کہن کی پاسداری کی حیثیت رکھتا ہے نصاب تعلیم سے حذف کر دیا جائے۔

۶) دعوتی تربیت: کار دعوت کے لیے میدان دعوت میں اترنے سے قبل دعوت کے اصول وآداب، انداز واسالیب کی علمی وعملی تربیت کا اہتمام از حد ضروری ہے۔ داعیان کے دعوتی تجربات سے استفادہ اور انبیائی دعوتی اسالیب کے عصری انطباقات کی تربیت کی بھی شدید ضرورت ہے ورنہ تغیر پذیر حالات سے عدم مطابقت داعی کی دعوت میں اجنبیت یا غیر عملیت پیدا کرسکتی ہے۔ ضروری ہے کہ داعی کو انسانیت کی عصری ضروریات، اس کے مسائل سے واقفیت بھی ہو اور اس کے اسلامی حل کو بھی وہ جانتا ہو۔ اس لحاظ سے داعی کو اپنی دعوت، مواد دعوت (Content of Dawah) میں ضروری تبدیلیوں کا شعور وعرفان حاصل ہو۔ عصری موضوعات ومسائل کو وہ اچھے سے ڈیل (deal) کرسکتا ہو، اور اس ضمن میں مخاطب کو مطمئن کرنے کی مہارت کا حامل ہو۔

۷) علاوہ ازیں، مدارس کے نظام تعلیم کا یہ سقم ہے کہ وہ اپنے فارغین کو خطیب ومناظر، مدرس ومہتمم مدرسہ کے قالب میں تو ڈھالتا ہے لیکن وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے ''داعی'' کے کردار واوصاف سے متصف نہیں کرتا یا کم کرتا ہے۔ شعلہ بیانی، طلاقت لسانی، لفظیات کی فراوانی تو شاید اس کی گفتگو میں پائی جاتی ہے، لیکن مخاطب کے تئیں ہمدردی وغم گساری، رفق ولینت (Soft speaking) اخلاص کی بے کراں کیفیات، داعیانہ اضطراب وانہماک سے تہی دامنی، فارغین مدراس کے لیے قابل توجہ امر ہے۔ ان کا مزاج عام طور پر ''افتاء'' کا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کار دعوت میں نری فتویٰ بازی نفس دین اور دعوت دونوں کے لیے مضر ہے۔

۸) ایک اور امر جس کا لحاظ ضروری ہے وہ نفسیات انسانی سے واقفیت ہے۔ اس لیے انسانی نفسیات، جذبات، احساسات، میلانات، ورجحانات سے واقف کروانے کے لیے مضمون ''نفسیات'' کو بھی داخل نصاب کرنا چاہئے اور نفسیاتی تعلیم سے متعلق ورکشاپ کا انعقاد بھی کیا جانا چاہے تا کہ مشن دعوت کے علمبرداروں کی انسانی نفسیات سے عدم واقفیت ان کے کار دعوت کو متأثر و بے فیض نہ کر دے۔

۹) کارِدعوت وہ مقدس مشن ہے جس کی راہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ پُر خار ہیں، کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ کے نتیجہ میں دعوت اور داعی دونوں کی مخالفت کے امکانات ہر وقت موجود رہتے ہیں اس لیے ایک داعی کو، بالخصوص مدارس کی پر عافیت ومحفوظ فضاؤں کے عادی فارغین مدارس کو پیشگی ان خطرات کا اندازہ کروایا جائے کہ کس طرح ایک نبی کو بحیثیت داعی مکہ کے بازاروں اور گلیاروں میں ظلم، سفا کیوں، شعب ابی طالب کی کلفتوں، طائف کے سبزہ زاروں کی مصیبتوں، ہجرت کی مشقتوں، غزوات کی جراحتوں، شہداء کی لاشوں کو اٹھانے کی عزیمتوں کے مراحل سے گزارا جاتا ہے اور ان سخت مراحل کو خندہ پیشانی سے عبور کرنے کی قوت داعی کا سرمایہ ہے۔

فارغین مدارس کی کارِدعوت کے لیے تیاری میں ان نکات ملحوظ رکھ کرانہیں میدانِ دعوت کے شہ سوار کی حیثیت سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ چھوٹے موٹے دعوتی تجربات کے یہ کچھ حاصلات ہیں جن کو مزید غور وخوض کے لیے پیش کرنا مقصود ہے، امید کہ ان پر کھلے ذہن کے ساتھ تدبر کیا جائے گا۔

● **جوھر جاوید (فلاحی)**، گیا، بہار۔ موبائیل نمبر: 8409640946

دعوت دین بلا اختلاف ونزاع امت مسلمہ کا اجتماعی نصب العین ہے۔ اور علمائے دین امت کو دین پر قائم رکھنے اور ساری انسانیت کو دین کی طرف بلانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس عظیم ترین ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ وہ اجتماعی طور پر اس فریضے کو انجام دیں۔ دعوت دین کا مقصد اولاً امت مسلمہ کی زندگی کے تمام امور میں دینی رہنمائی کرنا اور انہیں باطل اور غیر اسلامی ماحول کے اثرات سے بچانا، اور ثانیاً امت اور انسانیت کی تعمیر اور فلاح کے لیے کوشاں رہنا ہے۔

اللہ کا فضل ہے کہ مدارس اسلامیہ، ہندو پاک میں گزشتہ چند دہائیوں سے دعوت دین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، وقتاً فوقتاً دعوت دین کے عناوین پر مختلف قسم کے پروگرامس کی خبریں بھی ملتی رہتی ہیں، یہ امت کے مجموعی دعوتی کردار کے لیے اچھی علامت ہے۔ مگر ہنوز وہ مثالی کردار جس کا امت اسلامیہ سے بحیثیت مجموعی مطالبہ ہے، وہ ہمارے معاشرے میں نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے دین اور فارغین مدارس کے دعوتی کردار کو مؤثر اور فعال بنانے کے لیے 'حیات نو' کے ذمہ داران نے 'کار دعوت

کے لیے فارغین مدارس کی تیاری' جیسے اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

کاردعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری کے حوالے سے بہت ساری باتیں ہوتی رہتی ہیں، اس موضوع پر ماہرین مقالات اور خطابات کے ذریعے فارغین مدارس کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ذیل میں بے حد اختصار کے ساتھ کچھ باتیں عرض کی جارہی ہیں:

(۱) سب سے اہم بات جس کی جانب ہمارے مدارس و جامعات کے اہل حل وعقد کو توجہ مرکوز کرنی چاہئے، وہ مدارس کا داخلی نظام ہے۔ اس داخلی نظام سے میری مراد یہ ہے کہ مدارس و جامعات کی فضا اور اس کی آب و ہوا میں مجموعی طور پر دعوتی کردار کی بوٗباس پائی جاتی ہو۔ مدرسہ یا جامعہ میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد ہی کوئی اجنبی اس بات کا احساس کرلے کہ یہ مدرسہ دعوتی کردار کا حامل مدرسہ ہے۔ طلبہ سے لےکر اساتذہ تک اور دارالاقامہ سے لےکر درس گاہ تک ایک خاموش دعوتی کردار کا انسان اپنے چشم دل سے نظارہ کرسکے۔ طلبہ واساتذہ کا انداز گفتگو، انداز نشست و برخواست، اور شب و روز کی سرگرمیاں سب اس بات کا پتہ دے رہی ہوں کہ یہ لوگ دعوتی مزاج اور دعوتی تڑپ رکھنے والے لوگ ہیں۔ ایسے دعوتی ماحول کو ترقی دینا مدرسہ اور جامعہ کے لیے سب سے اہم کام ہے۔

(۲) اس حوالے سے دوسری سب سے اہم بات طلبہ کی انفرادی تیاری ہے، اس کے لیے طلبہ کو درج ذیل امور پر خود کو تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے: (الف) قرآن کریم نے توحید کے اثبات پر جو دلائل قائم کئے ہیں، ان کو اس طرح ذہن نشین کرلیا جائے کہ ذہن و دماغ پر نقش ہوجائیں، اور ہمیشہ مستحضر رہیں۔ (ب) توحید پر قرآن مجید نے جو عقلی استدلال کیا ہے، اس پر دعوتی کردار کے حامل طلبہ کی گہری نظر ہونی چاہئے، تاکہ مدعو سے گفتگو کرتے ہوئے اعتماد اور یقین کا احساس ہو۔ (ت) توحید کے قبول کرنے سے انسانی فکروعمل میں کیا انقلاب رونما ہوتا ہے اور کن وجوہ سے رونما ہوتا ہے، اس کی تفصیل پر طلبہ کی اچھی نظر ہونی چاہئے۔ (ث) دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے واقع ہونے پر قرآن نے مادی چیزوں سے جو دلیلیں دی ہیں، ان کی مثالوں پر غور و تدبر کرنا چاہئے۔ (ج) حیات بعدالموت اور قیامت کے متعلق قرآنی استدلال کا گہرا مطالعہ اور اس پر عبور حاصل کرنا بے حد مفید ہوگا۔ (چ) آفاق و انفس میں توحید کے دلائل سے اچھی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شرک کی نااہلی اور بودے پن کو قرآن نے جس طرح واشگاف کیا ہے اور اس کے نقصانات بیان کئے ہیں، ان پر دعوتی کردار کے حامل طلبہ کی اچھی پکڑ ہونی چاہئے۔ (ح) جنت و دوزخ سے متعلق قرآنی بیانات پر مشتمل ایک جامع نقشہ طلبہ کے ذہن میں ہمہ تن واضح اور تیار ہونا چاہئے۔ دعوتی گفتگو کرتے ہوئے اس سے بڑی مدد ملے گی۔ حساب و کتاب اور جزاوسزا کے قرآنی بیانات سے مدعو کے ذہن کو اپیل کرنے کا داعیہ

طلبہ کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔(خ) توحید، رسالت، آخرت، مساوات انسانی، بھائی چارہ اور اخوت ومحبت پر مبنی قرآنی بیانات کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہئے۔(د) قرآن کریم میں انبیائی دعوت کی جو کارگزاری مختلف صورتوں میں بیان کی گئی ہے، اس کا گہرا مطالعہ اور موجودہ حالات میں اس کی تطبیق کی راہیں تلاش کرنی چاہئیں۔(ذ) کیونکہ ہندوستانی سماج میں دعوتی کام کرنا ہے، لہذا یہاں کی تاریخ، مذاہب، مذاہب کی بنیادوں، اور برادران وطن کے سوچنے سمجھنے کے انداز سے بھی واقفیت بہم پہنچانا بہت ضروری ہے۔ ان سب چیزوں پر اچھی دسترس حاصل کرنی چاہئے۔(ر) غیر مسلم اذہان کے عمومی سوالات کا مدلل جواب دعوتی کام کرنے والے طلبہ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے اس موضوع پر ذاکر نائیک کی کتاب اور سہ روزہ دعوت کے خصوصی شمارے کا مطالعہ مفید ہوگا۔(ڑ) اسلام کے خلاف میڈیا کے ذرائع سے جو زہرافشانی کی جاتی رہی ہے، اس پر نہ صرف یہ کہ طلبہ مدارس کی اچھی نظر ہو، بلکہ اس کا مسکت جواب دینے کے لیے بھی تیاری ضروری ہے۔

(۳) کار دعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جن مدارس یا جامعات میں شعبہ دعوت کا ہنوز آغاز نہیں ہوسکا ہے، یا جہاں آغاز ہوکر بند ہوگیا ہے، وہاں اس شعبے کی اہمیت کے پیش نظر اس جانب توجہ دینی چاہئے، اور جن مدارس یا جامعات میں شعبہ دعوت پہلے سے موجود ہے، وہاں موجودہ حالات، رجحان، اور ضروریات کا جائزہ لے کر نصاب کو زیادہ بہتر، منظّم اور کارآمد بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایک دو جامعات کے شعبہ دعوت کے نصاب پر جو سرسری نگاہ پڑی ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شعبہ دعوت کا نصاب بہت معیاری نہیں ہے۔ وہی مواد جو فضیلت یا اختصاص کے درجات میں پڑھائے جاتے ہیں، شعبہ دعوت میں بھی اسی انداز سے شامل نصاب ہیں، بس دعوتی امور پر لکھی گئی چند کتب کا اضافہ۔ شعبہ دعوت کے لیے ایک بہترین اور منظّم نصاب کی تیاری بھی اہل مدارس کی ہی ذمہ داری ہے۔ اس جانب بھی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

ان باتوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ان سب پر توجہ دینی چاہئے، مگر اس سے یہ یقین دہانی نہیں کرائی جاسکتی کہ ۱۰۰ ر فیصد طلبہ دعوتی کردار کے حامل بن جائیں گے، لہذا مدارس کے اہل حل وعقد کی ذمہ داری ہے کہ دعوتی رجحان رکھنے والے طلبہ کی نشاندہی کرکے، ان پر توجہ دیں، اور ان کی انفرادی لیاقتوں کو قوم وملت کے لیے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کریں، اس حوالے سے ایک بہت ہی دلچسپ بات ذہن میں آرہی ہے، جامعۃ الفلاح میں جب شعبہ دعوت کا آغاز ہورہا تھا، اس وقت میں وہیں زیر تعلیم تھا، مہتمم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ شعبہ دعوت میں کن لوگوں کو داخلہ ملے گا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا: ''طلبہ کا بلڈ ٹسٹ کرایا جائے گا، جن کے ڈی

این اے میں دعوتی رجحان پایا جائے گا، شعبہ دعوت میں ان ہی کو داخلہ ملے گا''، یہ بہت اہم بات ہے، اس جانب بھی توجہ ہونی چاہئے، ورنہ محنت رائگاں جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ اپنی غیر نصابی سرگرمیوں میں دعوت دین کو مرکزی حیثیت دیں۔ تقابل ادیان پر طلبہ کی تیاری کرائیں، اس کے ساتھ ساتھ صحافتی مشق بھی ضروری ہے۔ وقتاً فوقتاً دعوتی موضوعات پر لکچرس کا اہتمام اور دعوتی میدان کے ماہرین سے تبادلہ خیال، نیز دعوتی ورکشاپ کا انعقاد بھی مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہوگا، وباللہ التوفیق

● **ذوالقرنین حیدر سبحانی**، الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم۔ کیرلا، ای میل:
zhaidersubhani@gmail.com

دعوت دین کا کام باقاعدہ ایک الگ شعبے کے طور پر کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی بہت کارآمد۔ دعوت کا کام ایک مخصوص قسم کی روٹین کے لئے ہمہ وقتی فراغ بھی نہیں چاہتا۔ دعوت ہر مسلمان کی منصبی ذمہ داری ہے۔ جو اسے ہر میدان اور ہر مشغولیت میں رہتے ہوئے ادا کرنی ہوتی ہے، البتہ صحیح معنوں میں دعوت کے تقاضوں کو سمجھنا اور پورا کرنا محنت طلب اور نازک کام ہے۔ دعوت نہ تو اتنا معمولی اور غیر اہم کام ہے کہ ہر کام اور میدان میں ناکام ہو جانے والا شخص اس کو اپنا میدان اور زندگی کا پیشہ بنا لے، اور نہ ہی اتنا آسان اور ہلکا کام ہے کہ جو آدمی کسی بھی میدان میں اپنی صلاحیت ثابت نہ کر سکے اور کسی بھی فن میں مہارت حاصل نہ کر سکے وہ دعوت کو اپنے تخصص کا موضوع بنا لے۔ دعوت کا کام اپنے لئے ایک بڑی تیاری اور توجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ دعوت یوں تو ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جو دین کو سمجھ جائے، شعوری طور سے اس کو قبول کر لے، اور اس کے تقاضوں کے لئے خود کو آمادہ کر لے، مگر مدارس اسلامیہ کے طلبہ واساتذہ اور وابستگان پر یہ ذمہ داری یک گونہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ تو براہ راست دین کے مصادر ومراجع سے وابستہ ہوتے ہیں، اور دین کا علم بلا واسطہ حاصل کرتے اور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ دین کو لوگوں تک اس کی اصل شکل میں پیش کر دینا ان کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ دین آیا اور غالب بھی ہوا، اور آئندہ بھی غلبہ اسی کا ہے، اس کا بھی اصل راز دعوت کی وہ قوت تاثیر ہے، جو افراد اور قوموں کے دلوں کو بآسانی فتح کر سکتی ہے، مگر بدقسمتی سے آج ملت اسلامیہ بالعموم اور مدارس اسلامیہ بالخصوص دعوت کے تعلق سے ایک مردہ، بے روح اور بے کیف تصور رکھتے ہیں، اور اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ خود دین کے تعلق سے وہ ناقص اور بے جان تصور کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ خود دین کو ایک محدود اور تنگ مفہوم میں قید کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ دعوت کے تصور پر بھی پڑتا ہے۔ دعوت کے تعلق سے اہل مدارس کے یہاں

اس قدر غیر ذمہ داری اور کوتاہ نظری کا ثبوت ملتا ہے کہ لوگ یہ تک کہنے پر مجبور ہوئے کہ دعوت کے کام اور طریقہ اور نظریہ کو سب سے بڑا نقصان اہل مدارس سے پہنچا ہے۔ یہ ایک تأثر ہے جس کے اوپر گفتگو کی جا سکتی ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ مدارس دین اور پھر دعوت دین کے جس تصور کے حامل ہوتے ہیں وہ دعوت کے لئے بھی ایک منفی اثر رکھتا ہے اور دین کی امیج کو بھی متأثر کرتا ہے۔

فارغین مدارس سے پہلے خود مدارس کے ڈھانچے، نصاب اور نظام میں ایک بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے، عموماً مدارس کی اپنی ایک الگ دنیا ہے جو کسی پرانے دور کی یادگار لگتی ہے اور خارج کی دنیا اس سے بالکل مختلف اور بدلی ہوئی ہے، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کی کسی تبدیلی کے بھی روادار نہیں، بلکہ اس قدامت پرستی کو اپنے لئے فخر کا باعث سمجھتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر اس کی وکالت کرتے ہیں۔

مدارس مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے تبدیلی کے محتاج ہیں:

سب سے اہم کام مدارس کے نصاب میں تبدیلی لانا ہے، ہمارے مدارس میں عموماً وہ بحثیں اور مسائل پڑھائے جاتے ہیں جن کا وقت کے مسائل سے دور دور تک کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ نصاب کا وقت کی ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ ساتھ ہی ابھی تک کے رائج کسی بھی نصاب میں دعوتی ضروریات کا خیال بھی نہیں رکھا گیا ہے، کہیں کہیں مقارنہ ادیان کو دعوت کے نام پر داخل نصاب تو کر دیا گیا ہے مگر اسی طرح جس طرح معاشیات وغیرہ کو مارک شیٹ میں دکھانے کے لئے داخل کر دیتے ہیں، جس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ سابق امیر جماعت ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب مرحوم نے نصاب میں دعوتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک خاکہ پیش کیا تھا جو مدارس کے لئے تبدیلی کا بہترین بدل بن سکتا ہے۔ جس میں مذہب کی ضرورت، ہندوستانی مذاہب کا تعارف، ہندوستانی مذاہب اسلام کی نظر میں، ہندوستان میں دعوت اسلامی، داعیان اسلام کی تربیت وتیاری اور انگریزی زبان کی تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔

دوسری اہم چیز زبان ہے، زبان کے تعلق سے عموما مدارس کی ذہنیت بڑی تنگ اور محدود ہے، گرچہ کی تبدیلی کی جھلک دیکھنے میں آئی ہے مگر ہنوز رفتار بہت سست ہے۔ اگر داعی اور مدعو کی زبان باہم مختلف ہو تو دعوت میں تاثیر نہ کے برابر ہو جاتی ہے۔

تیسرا ایک بڑا چیلنج کلچر اور ثقافت کا ہے، اور یہ نہایت اہم اور غور طلب مسئلہ ہے کہ کیا ثقافت اور کلچر کی ایک خلیج کے رہتے ہوئے ہم اپنی دعوت کے لئے سامنے والے کے دل میں راستہ بنا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی سوچنے کا موضوع ہے کہ ثقافت کے نام پر ہم کس حد تک ملک وعلاقہ کی ثقافت کو قبول کر سکتے ہیں، اور کہاں ہمارے لئے سختی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں بھی مدارس کے یہاں عدم توازن کا

ثبوت ملتا ہے۔ لباس اور وضع قطع کے نام پر کس حد تک ہم کو سخت اور بے لچک ہونا چاہئے، اور کہاں تک رواداری کا رویہ اپنانا چاہئے؟ یہ سوچنے کا سوال ہے۔

جدید وسائل و ذرائع کے تعلق سے بھی مدارس کو اپ ڈیٹ کرنا دعوت کے لئے ناگزیر ہے۔ پیغام رسانی کے ہر دور اور ہر جگہ کے اپنے اپنے موثر ذرائع اور طریقے ہوتے ہیں۔ اور ان کو سمجھنا اور اس میں دعوت کو پیش کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر آج ڈیجیٹل طریقے مؤثر ترین طریقے مانے جاتے ہیں، اور یہ نہایت آسانی سے لوگوں کے ذہن کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ایسے میں ان سے بے توجہی یا غفلت برتنا دعوت کی مہم کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

● **فخر الاسلام اعظمی (فلاحی)**، اسلامی اکیڈمی، نئی دہلی۔ ای میل: **Fislamfalahi@gmail.com**

اس موضوع کے تین حصے ہو سکتے ہیں:

(۱) کار دعوت (۲) فارغین مدارس (۳) دعوت کے کام کو فارغین مدارس کس قدر حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں، اور یہی اس موضوع کا اہم حصہ ہے۔

کار دعوت کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کار دعوت دراصل اپنے قول وعمل اور اخلاق و کردار کے ذریعہ سے اسلام کی نمائندگی کرنے کا نام ہے، اور یہ اس وجہ سے ہے کیونکہ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلمکے بعد اب یہ انبیائی کام امت مسلمہ پر فرض ہے۔

فارغین مدارس کی جب ہم بات کرتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مدارس کیا ہیں، جن کے فارغین کی بات کی جا رہی ہے۔ ان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ان کی حیثیت کیا ہے وغیرہ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ہمارے سینکڑوں علمائے کرام نے لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔

فارغین مدارس کار دعوت کے لیے کیسے تیار ہوں؟ اور وہ دعوت کے میدان میں کیسے ایک مؤثر رول ادا کریں؟ اس موضوع پر اجتماعی گفت وشنید اس بات کی متقاضی ہے کہ کہیں نہ کہیں ضرور کار دعوت میں فارغین مدارس کچھ خاص رول ادا نہیں کر پا رہے ہیں، اور ہمیں یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں کہ انہیں مدارس کے فارغین نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا، اور پھر ایک عرصہ تک فارغین مدارس عربیہ اسلامیہ نے کشتیٔ اسلام کی بادبانی کی تھی، لیکن آج اُن ہی مدارس یا اُن کے فارغین میں کیا کمی رہ جا رہی ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کے ایک عظیم فریضہ کو کما حقہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

یہ مدارس مختلف ذرائع سے طالب علموں پر اثر انداز ہوتے ہیں:

۱)تعلیمی نظام:تعلیمی نظام بہرحال انسان کی ذہن سازی کا ذریعہ ہے۔جس طرح کا تعلیمی نظام ہوگا اسی طرح کی ذہنیت اور سوچ پروان چڑھے گی۔ ہمارے مدارس کا تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہئے جو طلبہ کے اندر حرکت پیدا کردے۔اوران کے اندر دعوت الی اللہ کا جذبہ پیدا کردے۔ساتھ ہی ساتھ طلبہ کے اندر تجزیاتی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ان کے ذہن کو تخلیقی بنایا جائے،تاکہ موجودہ دور میں جو دانشور طبقہ ہے اس سے سابقہ پڑنے پر ان کے ہوش نہ اڑنے پائیں،وہ ہر سوال کا منطقی اور دانشورانہ جواب دے سکیں،کلاسیز کے دوران ان کو intraction کی اجازت دی جائے۔اور خاص طور سے اس وقت جب طلبہ اونچے کلاس میں ہوں تو پڑھانے کا طریقہ افہام وتفہیم کا ہو،اسباق کو پلانے کا نہیں۔ان تمام چیزوں سے ان کے اندر خوداعتمادی پیدا ہوگی جو کہ کسی بھی میدان کار کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

۲)معلمین واساتذہ:معلمین واساتذہ کسی بھی مدرسہ کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں اور ایک کامیاب طالب علم کے پیچھے ایک کامیاب استاذ کا ہاتھ ہوا کرتا ہے۔یہ کتنا ہی افسوسناک معاملہ ہے کہ ایک طرف تو ہم فارغین مدارس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ سماج میں اپنی دانشوری اور علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر دعوت اسلام کا فریضہ عمدہ ترین طریقوں پر ادا کریں گے۔اور دوسری طرف ہم ان کی تعلیم وتربیت کے لئے اونے پونے دام میں غیر صلاحیت منداشخاص کو رکھ لیتے ہیں،اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ باصلاحیت لوگ مدارس کی اندرونی سیاست کا شکار ہوجاتے ہیں۔۔۔۔۔چنانچہ اگر آپ اپنے مدرسوں کے لئے ایک اچھے استاد کا انتخاب نہیں کرتے ہیں تو اس بات کی توقع رکھنا کہ اس کے فارغین باصلاحیت اور فروغ اسلام میں معاون ہوں گے،محض خام خیالی ہوگی۔

۳)تربیتی نظام: یہی وہ مدارس ہیں جن کی نسبت ہم دارارقم سے کرتے ہیں اور مسجد نبوی کے مدرسہ سے کرتے ہیں،تو موازنہ کیجئے کہ دونوں میں کیا کیا بنیادی فرق ہیں۔ ہمارے مدارس کے تربیتی نظام کا اس قدر برا حال ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا،اورعیاں راچہ بیاں۔۔۔ ہمارے مدارس کا تربیتی نظام جب تک مستحکم نہیں ہوتا اور ہمارے اندر ایسے اساتذہ نہیں ہوتے،جو اخلاق وکردار بناتے ہوں،جو باتیں کانوں تک نہیں بلکہ دلوں تک پہنچاتے ہوں۔اس وقت تک ہمارے مدارس میں کوئی روحانی واخلاقی ماحول پیدا نہیں ہوسکتا،اوراس کے فقدان کے نتیجے میں ہم سماج پر کبھی بھی اچھا اثر نہیں ڈال سکتے۔ ہندوستان میں اسلام کی ابتداعرب تاجروں کی آمد کے ساتھ ہوئی تھی تو جو لوگ بھی اسلام قبول کیا کرتے تھے،وہ ان کی سچائی،دیانتداری،اوران کے اخلاق سے متأثر ہوکر اسلام قبول کرتے تھے۔

۴)وسیع مطالعہ: دین اسلام کی دعوت کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔مطالعہ لوگوں کو سمجھنے کے لئے،مطالعہ باطل نظریات وافکار سے روشناس ہونے کے لئے،مطالعہ موجودہ حالات میں

اسلام کی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے، مطالعہ اپنے اندر اعتماد و حوصلہ پیدا کرنے کے لئے، لہذا اسلام کی دعوت کے لئے ہمہ جہتی مطالعہ کا ہونا ضروری ہے۔ مدرسے میں باقاعدہ مطالعہ کا ماحول ہو، اس کے لئے مواقع وذرائع مہیا ہوں۔ عموماً دیکھا یہ جاتا ہے کہ طلبہ سال بھر محض درسی مطالعہ میں ہی الجھے رہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھنے کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار بھی نہیں کر پاتے، اور نہ ہی اساتذہ کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، تاکہ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر ہو، وہ تہذیب حاضر کے مکر وفریب سے واقف ہوں، اور بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کی نمائندگی کرسکیں۔

میدانِ کار اگر ہندوستان جیسا تکثیری سماج ہو تو ہندوستانی مذاہب کا مطالعہ کرایا جائے، وقتاً فوقتاً ہندوستانی کلچر اور اس کے قدیم فلسفہ ونظریات سے متعارف کرایا جائے جو موجودہ دور میں مختلف نئی نئی شکلوں میں ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔

۵) دعوتی کیمپ: فارغینِ مدارس کو دعوتی تجربات سے گزارنا چاہیے، اس کے لئے باقاعدہ دعوۃ ورکشاپ ہو، جس میں دعوت، داعی، مدعو، اور طریقۂ دعوت پر تفصیلی وتخلیقی گفتگو ہو، اس میں ان کی ذہن سازی کی جائے، تعلیم کا مقصد ان پر واضح کیا جائے۔ ان کے اندر ہمت وحوصلہ پیدا کیا جائے کہ وہ ایک انبیائی مشن کے علمبردار ہیں۔

۶) سماجی تعلقات: کارِ دعوت کے لئے سماجی تعلقات کا استوار ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سماج سے مکمل طور پر جڑے ہوئے تھے، ہر ایک شخص کی نفسیات سے واقف تھے، آپ کے لئے مکہ مکرمہ کا کوئی شخص بھی اجنبی نہیں تھا، آپ کے ان سے ذاتی تعلقات بھی تھے، لہٰذا ہمیں اپنے مدارس کے طلبہ کی تربیت اور ان کی ذہن سازی اس نہج پر کرنی چاہئے کہ وہ سماج میں گھل مل سکیں، غیر مسلم بھائیوں سے بھی اچھے تعلقات ہوں، ان کی پریشانیوں کو اپنی پریشانی سمجھیں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوں تاکہ سماج میں ہماری ایک مثبت تصویر ابھر کر سامنے آسکے۔

آئندہ شمارے کا خصوصی موضوع

(۱) آئندہ شمارے کے لیے خصوصی کالم کا موضوع ”**دعوت اسلامی میں خواتین کا مطلوبہ کردار**“ متعین کیا گیا ہے۔

(۲) اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر اپنے افکار وخیالات اس طرح ارسال کریں کہ ۱۵/ **فروری** تک ہمیں لازماً موصول ہوجائیں۔

(۳) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے ۲/ **صفحات** سے زیادہ طویل نہ ہو۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (٦)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ہیڈ آف ریسرچ دار الشریعہ متحدہ عرب امارات

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

(ا) ایقن اور استیقن کے درمیان فرق

ایقن کا مطلب ہے یقین کیا، یہ ایمان سے قریب لفظ ہے، اور قرآن مجید میں اس کا استعمال بھی اس طرح کے مقامات پر ہوتا ہے جہاں ایمان کا استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے استعمالات بتاتے ہیں

کہ ایقان مومنوں کی ایک قابل تعریف صفت، بلکہ ایمان کا مترادف ہے، اس کی بہت ساری مثالیں ہیں، جیسے:

والَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُون۔ (البقرۃ:۴)

اور جو لوگ ایقان کی روش اختیار نہیں کرتے ہیں ان کی قرآن مجید میں مذمت کی گئی ہے، ذیل کی آیت اس کی ایک مثال ہے:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ۔ (الروم:۶۰)

ایقان مختلف صیغوں میں قرآن مجید کے متعدد مقامات پر آیا ہے اور ایک ایسے عمل کے طور پر آیا ہے جس کا مطالبہ بندوں سے کیا جاتا ہے، البتہ استیقان مختلف صیغوں کے ساتھ قرآن مجید میں صرف تین مقامات پر آیا ہے، اور تینوں مقامات پر وہ کسی قابل مذمت یا قابل تعریف عمل کے طور پر نہیں پیش کیا گیا ہے۔ استعمالات قرآنی کے اس واضح فرق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ معنوی لحاظ سے بھی دونوں کے فرق کو سمجھا جائے۔ عام طور سے لوگوں نے استیقان کو مبالغہ کے ضمن میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، کہ ایقان کے مقابلے میں چونکہ دو حرف یعنی سین اور تاء اس میں زیادہ ہوتے ہیں اس لئے اس کے مقابلے میں یہاں مفہوم میں قوت بھی بڑھ جائے گی۔ لیکن یہ عام قاعدہ نہیں ہے، مزید یہ کہ دونوں الفاظ کے قرآنی استعمالات اس فرق کی تائید بھی نہیں کرتے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کی رائے کے مطابق ایقن کا مطلب ہوتا ہے یقین کرلیا، جب کہ استیقن کا مطلب ہوتا ہے یقین ہوگیا یا یقین آگیا۔ یقین کرنا بندے کا عمل ہے جسے وہ دلائل وشواہد کی روشنی میں اختیار کرتا ہے، جبکہ یقین ہونا ایک کیفیت کا نام ہے جو ازخود دل پر طاری ہوتی ہے، اس میں انسان کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ایسا ہوسکتا ہے کہ آدمی کو یقین آجائے مگر وہ یقین کرنے کے بجائے جھٹلا دے۔ سورہ نمل کی آیت ۱۴/ میں اسی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ اگر دل میں یقین ہے اور آدمی اس کا اقرار بھی کرتا ہے، تو یہ ایقان ہے، لیکن اگر دل میں یقین ہے مگر آدمی انکار پر مصر ہے، تو یہ استیقان تو ہوسکتا ہے، ایقان نہیں ہوسکتا ہے۔ غرض ایقان اور جحود ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، جبکہ استیقان اور جحود ایک ساتھ ایک ہی شخص کے اندر جمع ہوسکتے ہیں۔

بہت سارے مترجمین نے ذیل کی آیتوں میں استیقن کا ترجمہ یقین ہوگیا کیا ہے اور وہی درست ہے، جبکہ بعض مترجمین نے یقین کرلیا کیا ہے جو استیقن کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ ذیل میں دونوں طرح کے ترجمے ذکر کئے گئے ہیں۔

(۱) وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً۔ (النمل:۱۴)

''اور انہوں نے ظلم اور تکبّر کے طور پر ان کا سراسر انکار کردیا حالانکہ ان کے دل ان (نشانیوں کے

حق ہونے) کا یقین کر چکے تھے''۔(طاہرالقادری)

''اوران کے منکر ہوئے اوران کے دلوں میں ان کا یقین تھا ظلم اور تکبر سے''۔(احمد رضا خان)

دوسرا ترجمہ صحیح ہے، کیونکہ یہاں یہ نہیں بتایا جارہا ہے کہ وہ یقین بھی کرتے تھے اور انکار بھی کرتے تھے، بلکہ یہ کہ دلائل کی وجہ سے دل میں تو یقین بیٹھ چکا تھا، مگر ظلم اور تکبر کے سبب وہ اس کی تصدیق کرنے اور اس پر ایمان لانے کے بجائے انکار کررہے تھے۔

(۲)وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَاناً وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلاً كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ۔ (المدثر:۳۱)

''اور ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے ہی مقرر کئے ہیں اور ہم نے ان کی گنتی کافروں کے لئے محض آزمائش کے طور پر مقرر کی ہے تاکہ اہلِ کتاب یقین کرلیں (کہ قرآن اور نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق ہے کیونکہ ان کی کتب میں بھی یہی تعداد بیان کی گئی تھی) اور اہلِ ایمان کا ایمان (اس تصدیق سے) مزید بڑھ جائے، اور اہلِ کتاب اور مومنین (اس کی حقانیت میں) شک نہ کرسکیں، اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے اور کفار یہ کہیں کہ اس (تعداد کی) مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اسی طرح اللہ (ایک ہی بات سے) جسے چاہتا ہے گمراہ ٹھہراتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے، اور آپ کے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ (دوزخ کا بیان) اِنسان کی نصیحت کے لئے ہی ہے''۔(طاہرالقادری)

''اور ہم نے دوزخ کے داروغہ نہ کیے مگر فرشتے، اور ہم نے ان کی یہ گنتی نہ رکھی مگر کافروں کی جانچ کو اس لیے کہ کتاب والوں کو یقین آئے اور ایمان والوں کا ایمان بڑھے اور کتاب والوں اور مسلمانوں کو کوئی شک نہ رہے اور دل کے روگی (مریض) اور کافر کہیں اس اچنبھے کی بات میں اللہ کا کیا مطلب ہے، یونہی اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہے اور ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے، اور تمہارے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ تو نہیں مگر آدمی کے لیے نصیحت''۔(احمد رضا خان)

دوسرا ترجمہ درست ہے، مذکورہ آیت میں استیقان کو اہل کتاب سے متعلق بتایا گیا، اور اہل ایمان کے سلسلے میں استیقان کے بجائے ایمان کے زیادہ ہونے کی بات کہی گئی۔ قرآن مجید کے بیانات اہل کتاب کو یقین تو فراہم کررہے تھے، مگر یقین آجانے کے بعد بھی ان کو یقین کرنے اور ایمان لانے کی توفیق نہیں مل رہی تھی۔ محض دل میں یقین کا ہوجانا ایمان وایقان نہیں ہے جب تک انسان اپنے ارادے

سے ایقان وایمان کے عمل کو انجام نہ دے۔ دوسری طرف اہل ایمان جو ایقان وایمان کی منزل پر فائز ہیں ان کے ایمان وایقان میں اضافہ ہورہا ہے۔

زیر گفتگو آیت کے سلسلے میں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ ترجمہ اس طرح کرنے کے بجائے کہ ''ہم نے ان کی گنتی کافروں کے لئے محض آزمائش کے طور پر مقرر کی ہے'' ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے کہ ہم نے ان کی گنتی کو کافروں کے لئے آزمائش بنادیا'' یعنی اللہ نے وہ تعداد اس لئے نہیں رکھی کہ وہ آزمائش بن جائے، تعداد تو اللہ تعالی نے اپنی مشیئت سے جتنی چاہی رکھی۔ البتہ اللہ کی طرف سے کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت وہ تعداد ان کے لئے آزمائش بن گئی۔

(۳) وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُم مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنّاً وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ۔ (الجاثیۃ:۳۲)

''اور جب تم سے کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے، اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے، تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے، بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں، اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے۔ ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا''۔ (فتح محمد جالندھری)

دوسرا ترجمہ درست ہے، اس آیت میں انکار کرنے والے یہ اعلان نہیں کررہے ہیں کہ ہم آخرت پر یقین نہیں کرتے ہیں یا یقین نہیں کریں گے، بلکہ بڑے شاطرانہ انداز سے یہ ظاہر کررہے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے جس کا دل کو یقین ہوسکے، اور جب دل کو یقین نہ ہو تو ایمان کیسے لایا جائے۔ اس طریقہ سے کفار آخرت کے دعوے کو ہلکا کرنے اور یقین سے فروتر بتانے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالی نے ان کی اس شرارت اور مکاری کو بے نقاب کیا ہے، اور اس کے سلسلے میں انہیں دھمکی دی ہے۔

(۲) إن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنّاً کا ترجمہ

سورہ جاثیہ کی مذکورہ بالا آیت کے اس ٹکڑے کا دو طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے:

''ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں''۔ (سید مودودی)

''بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں''۔ (فتح محمد جالندھری)

''ہم اُسے وہم و گمان کے سوا کچھ نہیں سمجھتے''۔ (طاہر القادری)

پہلے والے دونوں ترجموں میں لفظ ''ظـنـــا" کو مفعول مطلق مانا گیا ہے۔ جبکہ موخرالذکر دونوں ترجموں میں لفظ ''ظنا'' کو دوسرا مفعول بہ مانا گیا ہے۔

سیاق کلام پر غور کیا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ منکرین آخرت کتنی شدت کے ساتھ نظریہ آخرت کی تردید کرتے تھے، تو دوسرا ترجمہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ منکرین آخرت قیامت کے تصور کو گمان کے کسی بھی درجہ میں قبول کرنے کو آمادہ نہیں تھے، کیونکہ یہ تو ان کی اس ہٹ دھرمی اور دوٹوک انکار کی روش کو نقصان پہنچانے والی بات تھی جو انہوں نے تمام تر دلائل و براہین کے مقابلے میں اختیار کر رکھی تھی۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ انہیں قیامت کے آنے کا گمان ہے، وہ تو صاف صاف کہتے تھے کہ قیامت برپا نہیں ہوگی، وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ (سبا:۳) دوسری طرف سیاق کلام بھی یہی بتا رہا ہے کہ مخاطب قیامت کے وقوع کے سلسلے میں شدید انکار اور استہزاء کا موقف اختیار کئے ہوئے ہے۔

ایک طرف اللہ یقین دلا رہا ہے کہ قیامت برحق ہے اور ضرور آئے گی، تو دوسری طرف منکرین کا جواب یہ ہے، کہ قیامت کیا ہے ہم جانتے نہیں، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت ایک وہم اور گمان محض ہے، اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے قیامت کا یقین ہو سکے۔ بھولے پن کے لباس میں یہ جواب دراصل شدید قسم کے استہزاء اور انکار کی ایک شکل تھی۔ دوسرے بہت سارے ترجموں کے مقابلے میں فتح محمد جالندھری کے مذکورہ بالا ترجمہ سے اس پوری کیفیت کا صحیح اظہار ہوتا ہے۔

(۳) رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ کا ترجمہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اللہ نے ہوا کو مسخر کیا تھا، اس کا تذکرہ قرآن مجید میں ایک مقام پر اس طرح کیا گیا ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ۔ (ص:۳۶)

اس آیت کا ترجمہ عام طور سے لوگوں نے حسب ذیل کیا ہے:

”تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا“۔ (سید مودودی)

اس ترجمہ پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اصاب کے معنی چاہنے کے نہیں بلکہ کسی نشانے یا ہدف پر پہنچنے کے ہوتے ہیں، گو کہ مفسرین اور اہل لغت نے بعض حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ فعل ارادہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن وہ کوشش تکلف سے خالی نہیں لگتی، اور بہر حال اس لفظ کا اصل اور مشہور معنی تو وہ نہیں ہے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بتایا گیا کہ جو ہوا حضرت سلیمان کے لئے مسخر کی گئی تھی وہ اتنی تیز رفتار ہوتی تھی کہ ماہ بھر کا سفر صبح میں ہی طے ہو جاتا تھا، اور ایک اور ماہ کا سفر شام تک طے ہو جاتا تھا۔ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ۔ (سبا:۱۲) دوسری جگہ صراحت ہے کہ عاصفہ یعنی باد تند کو مسخر کیا تھا، وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ

الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْھَا۔ (الانبیاء:۸۱) ظاہر ہے ایسی تیز رفتار بادتند کے لئے رخاء تو نہیں آسکتا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''تو ہم نے اس کے لئے مسخر کردیا ہوا کو، جو اس کے حکم سے چلتی اس طرح کہ جب وہ منزل پر پہونچ جاتا تو مدھم پڑ جاتی''۔

گویا حَیْثُ أَصَاب اس ترجمہ کے لحاظ سے رُخَاءً کا ظرف ہے۔ جبکہ اوپر ذکر کئے گئے ترجمے میں حَیْثُ أَصَاب ظرف ہے تَجْرِیْ بِأَمْرِہ کا۔

معلوم یہ ہوا کہ خدا کے حکم سے ہوا اس طرح حضرت سلیمان کی خدمت گزار ہوگئی تھی کہ جب روانہ ہوتے تو اتنی تیز رفتار سے چلتی کہ ماہ بھر کا سفر گھنٹہ بھر میں طے ہو جاتا، اور جب منزل پر پہنچ جاتے تو تابع دار گھوڑے کی طرح اس کی رفتار ہلکی ہو جاتی۔ ایک گھوڑے سے یہ رویہ عجیب نہیں لگتا، کہ اس کی لگام شہ سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے، مگر ہوا اگر اس طرح کرے تو یقیناً بہت تعجب خیز بات ہے، اور اس کا ذکر خصوصی طور سے کرنے کی وجہ فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ ہوا کسی ایک رفتار سے نہیں چلے بلکہ اپنے دوش پر سوار شخص کی ضرورت اور خواہش کے مطابق تیز رفتار اور خراماں رفتار ہو جائے، یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اللہ رب العزت کی طرف سے بہت زبردست نشانی تھی، اور بہت بڑا اکرام و اعزاز تھا۔

(۴) والد اور ولد کا صحیح ترجمہ

لفظ والد کے اصل مفہوم اور مروجہ مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہے، اس فرق کا لحاظ مترجمین کے یہاں نہیں ہو سکا۔ عربی زبان میں جس طرح لفظ 'اب' باپ کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن 'ابوین' تغلیب کے طور پر ماں باپ دونوں کے لئے آتا ہے، اسی طرح 'والد' کا اطلاق دراصل ماں پر ہوتا ہے، کیونکہ ولد کا معنی جنا اور جنم دیا ہوتا ہے، یہ وہ کام ہے جسے عورت انجام دیتی ہے۔ بطور تغلیب ماں باپ دونوں پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے، والد اصلا ماں کے لئے ہوتا ہے اور باپ کے لئے اصلا 'مولود لہ' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: لَا تُضَآرَّ وَالِدَۃٌ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ۔ (البقرۃ:۲۳۳)

واضح رہے کہ یہاں اصل استعمال کی بات ہو رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اذا والد منها تربّد ضرعها ... جعلت لها السكين احدى القلائد

(اساس البلاغۃ للزمخشری (۱/۱۵۵)

اس شعر میں حاملہ اونٹنی کے لئے لفظ 'والد' استعمال کیا گیا۔

علامہ فیروزآبادی اس لفظ کی حقیقت کی یوں تشریح کرتے ہیں:

ووَلَدَت تَلِدُ وِلاداً ووِلادۃً والادۃً ولِدَۃً ومَولداً . وھی والِد وَوالِدَۃ. وشاۃ والد وَوالِدَۃ۔ (القاموس المحیط للفیروزآبادی)

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں والد کا لفظ آیا ہے وہاں دیکھنا چاہئے، اور اگر کوئی واضح قرینہ رکاوٹ نہ بن رہا ہو تو والد کا ترجمہ یا تو ماں ہونا چاہئے یا ماں باپ دونوں ہونا چاہئے۔ قرآن مجید میں لفظ والد دو مقام پر آیا ہے، اور دونوں مقامات پر اگر باپ کے بجائے ماں باپ کیا جائے تو معنویت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور ترجمہ لفظ کی حقیقت سے قریب رہتا ہے۔

وَاخْشَوْا يَوْماً لَّا يَجْزِئ وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئاً۔ (لقمان:۳۳)

اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے عام طور سے اردو مترجمین نے والد کا ترجمہ باپ کیا ہے:

''اور اس دن کا خوف کرو جس دن باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کا ذرا سا بھی نفع کرنے والا ہوگا''۔ (محمد جوناگڑھی)

انہوں نے ولد کا ترجمہ بھی بیٹے کیا ہے، حالانکہ ولد میں بیٹا اور بیٹی دونوں شامل ہوتے ہیں۔

آیت کے مذکورہ حصے کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے:

''اور اس دن کا خوف کرو جس دن ماں باپ اپنی اولاد کو کوئی نفع نہ پہنچا سکیں گے اور نہ اولاد اپنے ماں باپ کو ذرا سا بھی نفع دینے والی ہوگی''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

بعض انگریزی مترجمین نے Father کے بجائے Parent کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ولد کا ترجمہ son کے بجائے child کیا ہے جو لڑکے اور لڑکی دونوں کے لئے آتا ہے۔ یہ طریقہ بہت مناسب ہے۔

And fear a Day when the parent will not be able to avail the child in aught, nor the child to avail the parent.(Pickthall)

وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ۔ (البلد:۳)

اس آیت کے ترجمہ میں بھی عام طور سے مفسرین نے والد کا ترجمہ باپ کیا ہے۔

''اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی''۔ (سید مودودی)

اس کا درست ترجمہ اس طرح ہوسکتا ہے:

''اور قسم کھاتا ہوں ماں باپ اور ان کی اولاد کی''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

انگریزی کا حسب ذیل ترجمہ بھی صحیح مفہوم ادا کرتا ہے:

And (the mystic ties of) parent and child (Yousuf Ali)

خود مقسم علیہ یعنی لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ماں تو یہاں ضرور مراد ہے، کیونکہ مشقت کے ساتھ جس تخلیق کی بات کہی گئی ہے اس کا تعلق ماں سے زیادہ نمایاں

ہے کہ وہی ساری تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتی ہے۔

(۵) دُعِیَ اللہ کا ترجمہ

دعا کا مطلب بلانا اور پکارنا ہوتا ہے، جس کو بلایا جائے وہ مفعول بہ یا نائب فاعل بنتا ہے، اگر کسی کی طرف بلایا جانا مقصود ہو تو جس کی طرف بلایا جانا ہے اس پر الی کا صلہ لگتا ہے، اس کی مثالیں قرآن مجید میں خوب ہیں، جیسے:

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ۔ (النور:۴۸)

''جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف، تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے''۔ (سید مودودی)

یہاں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جانے کی بات ہے اس لئے الی کا استعمال کیا گیا ہے۔

وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا۔ (الاحزاب:۵۳)

''ہاں جب بلائے جاؤ تو حاضر ہو''۔ (احمد رضا خان)

یہاں مخاطب کو بلائے جانے کی بات ہے اس لئے مخاطب کی ضمیر بغیر الی کے مذکور ہے۔

مذکورہ ذیل آیت میں دعی کے بعد اللہ کا لفظ بغیر الی کے آیا ہے، اس کے باوجود بعض مترجمین نے اللہ کو پکارنے کے بجائے اللہ کی طرف بلانے کا ترجمہ کیا، جو زبان کے قواعد کے خلاف ہے۔

ذَلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ۔ (غافر:۱۲)

''یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو، اِس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اُس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے''۔ (سید مودودی)

''یہ انجام تمہارے سامنے اس وجہ سے آیا کہ جب اللہ واحد کی دعوت دی جاتی تو تم اس کا انکار کرتے اور اگر اس کے شریک ٹھہرائے جاتے تو تم مانتے۔ تو اب فیصلہ خدائے بلند و عظیم ہی کے اختیار میں ہے''۔ (امین احسن اصلاحی)

یہ دونوں ترجمے درست نہیں ہیں، دراصل آیت میں نہ اللہ کی طرف بلایا جانا مراد ہے اور نہ اللہ کی دعوت دینا، کیونکہ دونوں صورتوں میں الی کا صلہ آنا ضروری تھا، دراصل آیت میں تو تنہا اللہ کو پکارنا مراد ہے۔ اور پکارنے سے بھی دراصل عبادت کرنا مراد ہے۔

اکثر مترجمین نے آیت کا درست ترجمہ کیا ہے جیسے:

''یہ اس پر ہوا کہ جب ایک اللہ پکارا جاتا تو تم کفر کرتے اور ان کا شریک ٹھہرایا جاتا تو تم مان لیتے

توحکم اللہ کے لیے ہے جو سب سے بلند بڑا‘‘۔(احمد رضا خان)

آیت کے دوسرے حصے وَإِن يُشْـرَكْ بِـهِ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ پہلے حصے میں تنہا اللہ کی عبادت کی بات کی جارہی ہے نہ کہ اللہ کی طرف دعوت دینے کی بات۔

اس آیت کے مضمون سے ملتا جلتا مضمون سورہ زمر کی مذکورہ ذیل آیت میں بیان ہوا ہے:

وَإِذَا ذُكِـرَ اللَّـهُ وَحْـدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ۔ (الزمر:۴۵)

’’جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں، اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکا یک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں‘‘۔(سید مودودی)

(٦) حال کا ایک خاص استعمال

عربی زبان میں حال کا عام استعمال تو فعل کی انجام دہی کے وقت ذوالحال کی حالت بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے، جیسے جاء زید راکبا یعنی زید سوار ہو کر آیا۔لیکن حال کا ایک استعمال اس وقت بھی ہوتا ہے جب ایک فعل کے فوراً بعد دوسرا فعل شروع ہوتا ہے، ترجمہ میں اس کی رعایت سے ترجمہ کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔بعض مترجمین نے کچھ مقامات پر اس استعمال کے مطابق ترجمہ کیا ہے، جبکہ بعض دوسرے مقامات پر اس طرح ترجمہ نہیں کیا گیا، حالانکہ وہاں بھی اسی طریقہ پر ترجمہ کرنا زیادہ مناسب لگتا ہے، مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآؤُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلاَّ إِحْسَاناً وَتَوْفِيقاً (النساء:۶۲)

’’پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب اِن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ اُس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے‘‘۔(سید مودودی)

’’پھر کیا بات ہے کہ جب ان پر ان کے کرتوت کے باعث کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو پھر یہ آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو صرف بھلائی اور میل ملاپ ہی کا تھا‘‘۔(محمد جونا گڑھی)

پہلے ترجمہ میں ’’قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں‘‘ ہے، جس کے مقابلے میں دوسرا ترجمہ زیادہ مناسب ہے، یعنی آکر قسمیں کھاتے ہیں۔

(۲) مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مَّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ۔(الانبیاء:۲)

’’ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے

سنتے ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

اس ترجمے کے مقابلے میں ذیل کے ترجمے زیادہ مناسب ہیں:

''ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نئی یاددہانی نہیں آتی مگر یہ کہ کان لگا کر سن لیتے ہیں اور پھر کھیل تماشے میں لگ جاتے ہیں''۔(ذیشان جوادی)

''ان کے پروردگار کے پاس سے کوئی بھی نئی سے نئی نصیحت آئے، یہ اسے سن کر کھیل تماشے میں لگے رہتے ہیں''۔(امانت اللہ اصلاحی)

(۳) وَنَادَيْنَاهُ مِن جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيّاً۔(مریم:۵۲)

''ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے ندا کی اور راز گوئی کرتے ہوئے اسے قریب کر لیا''۔(محمد جوناگڑھی)

''اور اسے ہم نے طور کی داہنی جانب سے ندا فرمائی اور اسے اپنا راز کہنے کو قریب کیا''۔(احمد رضا خان)

''راز گوئی کرتے ہوئے''، یا''راز گوئی کرنے کو''، کے بجائے ترجمہ حسب ذیل ہونا چاہئے:

''اور ہم نے اس کو طور کے مبارک کنارے سے آواز دی اور قریب کر کے اس سے سرگوشی کی''۔(امانت اللہ اصلاحی)

(۴) وَلَا تَقْعُدُواْ بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجاً۔(الاعراف:۸۶)

''اور ہر راہ میں دھمکیاں دیتے، اہل ایمان کو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس راہ کو کج کرتے نہ بیٹھو''۔(امین احسن اصلاحی)

اس آیت میں تین افعال بطور حال آئے ہیں، ان کا ترجمہ حسب ذیل ہونا چاہئے:

''اور ہر راستے میں بیٹھ کر جو ایمان لائے انہیں دھمکیاں نہ دو اور اللہ کی راہ سے نہ روکو اس میں کجی کی خواہش کے ساتھ''۔(امانت اللہ اصلاحی)

(۵) وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وِرْداً۔(مریم:۸۶)

''اور مجرموں کو جہنم کی طرف ہانکیں گے پیاسے''۔(احمد رضا خان)

درست ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اور مجرموں کو ہانک کر جہنم کے گھاٹ پر پہنچائیں گے''۔(امانت اللہ اصلاحی)

(۵) فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ۔(البقرۃ:۲۱۳)

''پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے''۔(احمد رضا خان)

''تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبر دار کرتے آئے''۔(امین احسن اصلاحی)
درست ترجمہ یوں ہوگا:

''تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے جنھوں نے آکر خوش خبری سنائی اور خبردار کیا''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

بعض مترجمین نے یہاں حال کے بجائے صفت کا ترجمہ کردیا ہے لیکن ایسا کرنا زبان کے قواعد سے مطابقت نہیں رکھتا، جیسے:

''تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے''(سید مودودی)

(۷) سَرِیعُ الحِسَابِ اور سَرِیعُ العِقَابِ کا مطلب

قرآن مجید میں اللہ تعالی کی ایک صفت کے طور پر سریع الحساب کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ایک جگہ سَرِیعُ العِقَابِ بھی آیا ہے، سریع الحساب کے مفہوم کی تشریح کرتے ہوئے علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

والمعنى فى الآية: ان الله سبحانه سريع الحساب، لايحتاج الى عد ولاالى عقد ولا الى اعمال فكر كما يفعله الحساب ...فالله جل وعز عالم بما للعباد وعليهم فلا يحتاج الى تذكر وتأمل، اذ قد علم ما للمحاسب وعليه، لان الفائدة فى الحساب علم حقيقته--- وقيل: معنى الآية سريع بمجىء يوم الحساب، فالمقصد بالآية الانذار بيوم القيامة . (تفسير القرطبى،البقرة،الآية:۲۰۲)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرطبی نے آیت کے جس مفہوم کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ جب کسی کا حساب کرتا ہے تو اسے حساب کرنے میں دیر نہیں لگتی۔دوسرا مفہوم جو بعض لوگوں نے لیا ہے وہ یہ ہے کہ حساب کا دن اللہ بہت جلدی لے آئے گا۔لیکن اس دوسرے مفہوم کے لئے جو تکلف آمیز تاویل کرنا پڑتی ہے وہ مخفی نہیں ہے، اسی لیے قرطبی نے اسے صیغہ تضعیف سے ذکر کیا ہے۔

شبیر احمد عثمانی نے دونوں مفہوم بیک وقت مراد لئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:''یعنی حساب کا دن کچھ دور نہیں، جلد آنے والا ہے اور جب حساب شروع ہوگا تمام دنیا کا پائی پائی کا حساب بہت جلد بے باق کردیا جائے گا''۔(شبیر احمد عثمانی)

لیکن یہ دونوں معنی بیک وقت لینا صحیح نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں ایسے ہر مقام پر ایک ہی مفہوم لینا درست ہے اور وہ یہ کہ اللہ کو حساب لینے میں دیر نہیں لگتی ہے۔کیونکہ لفظ سریع کسی کام کو جلدی سے انجام دینے کے لئے آتا ہے، نہ کہ کسی کام کے وقت کے قریب آجانے کے لئے۔مثال کے طور پر اگر یہ کہنا ہو کہ زید کھانا جلدی کھالیتا ہے تو کہیں گے زید سریع الاکل۔لیکن اگر یہ کہنا ہو کہ زید جلد ہی کھانا

کھالے گا (مراد یہ ہو کہ وہ عنقریب کھانا کھالے گا) تو اس کے لئے زید سریع الاکل نہیں کہا جائے گا۔
سریع کے لفظ کا مفہوم انگریزی مترجمین نے زیادہ تر Swift کے لفظ سے کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ سریع کے مفہوم کی انگریزی زبان میں ادائیگی کے لئے بہت مناسب لفظ ہے۔

تراجم قرآن کا جائزہ لیتے ہوئے کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی ترجمۂ قرآن میں مختلف مقامات پر اس ایک لفظ کا مختلف طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے، مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئاً وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ (النور:۳۹)

''اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا (آدمی) اس کو (دور سے) پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس کو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور قضاء الٰہی کو پایا، سو اللہ تعالی نے اس (کی عمر) کا حساب اس کو برابر سرابر چکا دیا (یعنی عمر کا خاتمہ کر دیا) اور اللہ تعالی دم بھر میں حساب (فیصل) کر دیتا ہے''۔ (اشرف علی تھانوی، یہاں ترجمہ صحیح کیا ہے)

(۲) أُولَـئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُواْ وَاللّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ (البقرۃ:۲۰۲)

''ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے عمل کے، اور اللہ تعالی جلد ہی حساب لینے والے ہیں''۔ (اشرف علی تھانوی، یہاں ترجمہ صحیح نہیں ہے)

(۳) أُوْلَـئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ (آل عمران:۱۹۹)

''ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس، بلاشبہ اللہ تعالی جلدی ہی حساب کر دیں گے''۔ (اشرف علی تھانوی، یہاں ترجمہ صحیح نہیں ہے)

بہت سارے مترجمین سریع الحساب کا ترجمہ کرتے ہیں: بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے، یا جلدی حساب چکانے والا ہے، اس ترجمہ سے واضح نہیں ہوتا کہ مراد کیا ہے، کیونکہ اردو زبان کے لحاظ سے ذہن دونوں طرف جا سکتا ہے، یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ حساب کا وقت جلد آنے والا ہے، اور یہ بھی کہ جب اللہ حساب چکائے گا تو بہت جلدی چکا دے گا اور اس کام میں اس کو ذرا دیر نہیں لگتی ہے۔ ذہن کو دوسری طرف جانے سے بچانے کے لئے ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ ''اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی''، بعض مترجمین اس امر کا لحاظ کرتے ہیں لیکن بعض کے یہاں اس کا لحاظ نہیں ملتا۔

سریع الحساب کی طرح سریع العقاب کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ اس کو سزا دینے میں دیر نہیں لگتی، نہ یہ کہ وہ جلد اور عنقریب سزا دینے والا ہے:

إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (الانعام:۱۶۵)

''بیشک تمہارے رب کو عذاب کرتے دیر نہیں لگتی اور بیشک وہ ضرور بخشنے والا مہربان ہے''۔(احمد رضا خان)

(۸) **فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**۔ (البقرۃ:۱۹۶)

اس آیت کا ترجمہ لوگوں نے عام طور سے یوں کیا ہے:

''تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسر آئے''۔(امین احسن اصلاحی)

عام طور سے مترجمین اور مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا، اور پھر تکلف سے بھرپور تاویلوں پر مجبور ہوئے، کیونکہ حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھانے کا مطلب واضح نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ جب ایک شخص عمرہ کرکے احرام کی پابندیوں سے حج تک کے لئے آزاد ہوگیا، تو اس میں حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھانے کا کیا مطلب ہوا؟؟

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے آیت کا ترجمہ اس طرح تجویز کیا ہے:

''تو جو کوئی حج کے ساتھ ساتھ پہلے عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسر آئے''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

حج کے ساتھ عمرہ سے فائدہ اٹھانے کا مطلب بہت واضح ہے کہ جو ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرلے۔اس مفہوم کو اختیار کرنے سے سارے اشکالات اور تکلفات از خود دور ہوجاتے ہیں، اور مطلب یہ ہوا کہ اس نے ایک ہی سفر میں عمرہ کا بھی فائدہ حاصل کیا اور ساتھ ہی حج کا بھی فائدہ حاصل کرلیا۔

مخصوص مقامات پر الی مع کے معنی میں آتا ہے، اس پر نحو قرآنی کے امام فراء نے بہت اچھی گفتگو کی ہے، وہ کہتے ہیں:

وانما يجوز ان تجعل (الى) موضع (مع) اذا ضممت الشيء الى الشيء مما لم يكن معه؛ كقول العرب: ان الذود الى الذود ابل؛ أي اذا ضممت الذود الى الذود صارت ابلا . فاذا كان الشيء مع الشيء لم تصلح مكان مع الى، ألا ترى أنك تقول: قدم فلان ومعه مال كثير، ولا تقول في هذا الموضع: قدِم فلان واليه مال كثير. (معاني القرآن للفراء: ۱/۲۱۸)

الی بمعنی مع کی کچھ مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) وَلاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَهُمْ إِلَى أَمْوَالِكُمْ۔ (النساء:۲)

''اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ''۔(سید مودودی)

(۲) وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْساً إِلَى رِجْسِهِمْ وَمَاتُواْ وَهُمْ

كَافِرُونَ۔ (التوبۃ:۱۲۵)

’’اور جن کے دلوں میں روگ ہے اس سورت نے ان میں ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی بڑھا دی‘‘۔ (محمد جوناگڑھی)

(۳) وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ۔ (ھود:۵۲)

’’اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا‘‘۔ (سید مودودی)

(۴) قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَى نِعَاجِه۔ (ص:۲۴)

’’آپ نے فرمایا! اس کا اپنی دنبیوں کے ساتھ تیری ایک دنبی ملا لینے کا سوال بیشک تیرے اوپر ایک ظلم ہے‘‘۔ (محمد جوناگڑھی)

(۹) إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ (البقرۃ:۱۵۸)

اس آیت کا ترجمہ عموماً یوں کیا گیا ہے:

’’یقیناً صفا اور مروہ، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کر لے‘‘۔ (سید مودودی)

’’صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، اس لئے بیت اللہ کا حج وعمرہ کرنے والے پر ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی گناہ نہیں‘‘۔ (محمد جوناگڑھی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی حرف باء کو معیت کا مان کر اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

’’یقیناً صفا اور مروہ، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس پر کوئی حرج نہیں کہ (بیت اللہ) کا طواف ان دونوں (صفا و مروہ) کے ساتھ کرے‘‘۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ طواف کا لفظ خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے کے لئے تو آتا ہے، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کے لئے نہیں آتا، مزید یہ کہ حرف باء دو چیزوں کے درمیان کے معنی میں نہیں آتا ہے۔ اس ترجمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کوئی علیحدہ اور مستقل عمل نہیں ہے بلکہ خانہ کعبہ کے طواف سے ملحق عمل ہے۔ یعنی یا تو صرف خانہ کعبہ کا طواف ہوگا، جو عام حالات میں ہوتا ہے، اور یا پھر حج اور عمرہ کے ذیل میں خانہ کعبہ کا طواف صفا اور مروہ کی سعی کے ساتھ ہوگا۔

نگراں جو تھا اپنا۔۔۔

ڈاکٹر امتیاز وحید (فلاحی)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،
ای میل: ijnuwaheed@gmail.co

مدھوبنی کے ایک دور افتادہ گاؤں سے مختلف مکتبوں اور مدرسوں کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر ۱۹۸۶ء میں ہم نے جامعۃ الفلاح بلریا گنج کا رخ کیا۔ گاؤں سے اٹھ کر 'مدرسہ رحمانیہ' مدراس میں زیر تعلیم ہمارے اہل خانہ کا پہلا قافلہ تقریباً منتشر ہو چکا تھا۔ اس قافلے کی باقیات میں جامعۃ الفلاح صرف میرے اور میرے بڑے بھائی عامر اصغر کے حصے میں آیا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ آج زندگی کی جو نعمتیں ہمیں میسر ہیں، ان کی جڑیں بڑی حد تک جامعۃ الفلاح کے متمول تعلیمی اور تربیتی نظام میں پیوست ہیں۔ جامعۃ الفلاح دور حاضر میں جدید اور قدیم تعلیم و تربیت کا نمائندہ ادارہ ہے۔ نظم و نسق اور تربیت اس کا پہلا منشور ہے۔ 'تعلیمی نظام' کو ادارہ کے مذکورہ دونوں پہلوؤں نے سنبھال رکھا ہے۔ یہ چیزیں فرد، جماعت اور نظام سبھی سطحوں پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لہٰذا عربی کی پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہی انفرادی طور پر میری نگرانی میرے مرشد جناب شاد اعظم فلاحی کے ذمہ آ گئی۔ ہم اس منضبط نظام کے سانچے میں ایسے فٹ ہوئے کہ مکمل ہو کر ہی نکلے۔ یہ معاملہ تقریباً اس وقت زیر تعلیم سبھی ساتھیوں کے ساتھ تھا۔ کوئی نہ کوئی رشتۂ انسلاک ایسا ضرور نکل آتا تھا جس کی رہنمائی ہم نو واردان کے لیے اس وقت ضروری خیال کی جاتی تھی۔ وہ طلبہ جوان شخصی اور انفرادی فیضان سے محروم رہتے ان پر طلبہ تحریکیں اپنی رشد و ہدایت کی چادریں تان دیتیں، ان سب پہ مستزاد ادارہ کا وہ 'نظام نگرانی' تھا، جس کی ایک کڑی ہمارے نگراں ـــــ 'تابش مہدی صاحب' تھے۔

۱۹۸۶ء میں تابش مہدی کی جامعۃ الفلاح آمد سے قبل تابش پسندی کی عام فضا تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ سینئر طلبہ ایک ایسے شخص کے منتظر تھے جو استاد کے ماسوا شاعر اور قلم کار بھی ہے۔ ان کی گرمیٔ قلم کی طنابیں اکثر ان کی کتاب 'تبلیغی نصاب ایک مطالعہ' کے ذکر پر جا کر ٹوٹتیں اور ہم چپ چاپ ان کی آمد کے منتظر ہو جاتے۔ ان خبروں کے بیچ ایک شام معلوم ہوا کہ تابش مہدی صاحب آ چکے ہیں۔ 'مثالی بورڈنگ' (موجودہ 'حسن البنا منزل') کے سامنے ایک شخص طلبہ اور اساتذہ کے غول میں بیٹھا باتیں کرتا نظر

آیا۔ہم جیسے دہقانی طالب علم کے لیے اس شخص میں بڑی کشش تھی جو شاعر بھی ہے۔غالباً اس سے قبل میں نے کسی شاعر انسان کو دیکھا نہیں تھا۔تاک جھانک سے اپنی دہقانی اجنبیت کو سیرابی ہوئی اور پھر مستقل طور پر انھیں اپنا نگراں پایا۔ہم جس 'مثالی بورڈنگ' میں مقیم تھے تابش صاحب اسی کے نگراں بنائے گئے۔

'شعبۂ نگرانی' جامعۃ الفلاح کے تربیتی نظام کا ایک حساس قلمدان ہے، جس کا ایک وزیر یعنی نگرانِ اعلی ہوتا ہے اور اس کے ماتحت مختلف اقامت گاہوں کے مقامی وزراء یعنی نگرانوں کی ٹیم ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ 'تربیت' کا وہ پہلو اجاگر ہوتا ہے جسے جامعۃ الفلاح نے اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔ یعنی 'تعلیم و تربیت کا مستند مرکز'۔

تابش صاحب کے علاوہ 'مثالی بورڈنگ' میں اس وقت مرحوم ماسٹر ارشد صاحب اور مولانا اسمٰعیل فلاحی صاحب بھی نگرانی کے فرائض پہ مامور تھے۔ان تینوں نگراں حضرات کے لیے ایک مخصوص خطہ (Area) مقرر تھا۔ہم تابش مہدی صاحب کے حصے میں تھے۔وقت کی پابندی لازم تھی، نماز کا وقت، کلاس کا وقت، طعام اور کھیل کے اوقات گویا ہم وقت کے پابند تھے اور نگراں کی ذمہ داری ہمیں بہر صورت وقت کے محور سے باندھے رکھنا تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب جامعۃ الفلاح میں زندگی کی بہت ساری آسائشوں نے دستک نہیں دی تھیں۔ایک کمرہ میں تقریباً ۸/۱۰ طلبہ حسب گنجائش رکھے جاتے تھے۔کمرہ میں بجلی پنکھا نہیں تھا۔قرعہ اندازی سے کمرہ میں نشست تفویض (Allotment of Seat) کی جانے کی روایت تھی۔کھڑکی والی جگہ گویا نعمت غیر مترقبہ تھی۔سو یہ نعمت بحمد للہ مجھے بھی حاصل رہی۔ویسے تو ہماری ہاسٹل لائف میں نگراں کا رول وہیں نظر آتا جب ہم متعین خطوط یا صراط مستقیم سے منحرف ہوتے، نہیں تو زندگی پر سکون گزرتی۔البتہ نماز کے اوقات میں یہ حضرات کچھ زیادہ فعال ہوجاتے۔ہر روم میں جاتے اور منحرفین پر خاص نگاہ رکھتے اور بیشتر ان ہی کے اسماء ان کی زبان پر ہوتے اور پھر تیزی سے اپنے خطے کے فرائض سے نپٹ کر مسجد کا رخ کرتے۔یہ تقریباً روز کا معمول تھا، ان کی فعالیت کا صحیح وقت فجر کا وقت تھا، ایک ایک کمرہ کے دروازے پر دستک دیتے، سب کو اٹھاتے اور پوری جانفشانی دکھاتے۔نگرانوں کی تگ ودو کا عالم دیدنی ہوتا تھا، بس اتنا سمجھ لیجیے سب اپنا سُر الاپتے ہوئے نظر آتے۔ہر نگراں کا لب ولہجہ ظاہر ہے ایک ہی عہد کے معاصر شاعروں کی انفرادیت کی طرح جداگانہ ہوتا تھا، مرحوم ماسٹر ارشد صاحب ''بچے اٹھو، اٹھو فجر کی نماز کا وقت ہوگیا'' کہتے ہر کمرے پہ دستک دیتے اور اس وقت پھر لہجہ میں سختی آجاتی جب انہیں یہ عمل دہرانا پڑتا۔مولانا اسمٰعیل صاحب کو اپنے حصے کے سبھی کمروں کے باشندوں کا نام ازبر تھا، وہ اپنے مخصوص لہجہ میں گویا ہوتے اور سماں باندھ دیتے—— ''امتیاز، عبدالودود، تنویر، شمشاد، صداقت، لیاقت، شہنواز، سمیع اللہ، سہیل اٹھتے نہیں جی''، یہ لہجہ غالباً دوسری بار بیدار کرنے پر اختیار کرتے، پہلی دفعہ

لب ولہجہ عموماً سپاٹ ہوتا، یہ عمل کئی بار دہرایا جاتا۔ تا آں کہ کمرے مکینوں سے خالی ہو جائیں۔ ماسٹر قاضی زین العابدین مرحوم کا قیام مولانا اسمٰعیل صاحب کے ساتھ ایک ہی کمرے میں تھا۔ تاہم ان کا علاقہ 'مثالی بورڈنگ' کے گراؤنڈ فلور کا کوئی حصہ تھا۔ وہ عموماً بڑی عجلت میں دیکھے جاتے، وہ بیک وقت فرضِ نگرانی کے ساتھ معدے کے جبر سے بھی نبرد آزما رہتے۔ فجر کے وقت فرائض نگرانی کا عجیب سماں ہوتا۔

تابش مہدی صاحب کا انداز نرالا تھا۔ انھوں نے غالباً اپنے خطے کے جملہ کمروں میں ایک ذمہ دار فرد کی شناخت کر رکھی تھی۔ اس کا نام لیتے اور کمرہ کھلتے ہی تیزی سے کمرے میں داخل ہوتے اور پھر اسی سرعت سے قدم پیچھے ہٹا کر ''لاحول ولاقوۃ'' پڑھتے دروازے پر واپس لوٹ جاتے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں آٹھ، دس نوجوانوں کی بھیڑ سے ظاہر ہے تعفن سے یکسر انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ ان کا روز کا معمول تھا، اپنے اس رویہ سے وہ تعفن زدگی کا تأثر قائم کرنے میں عموماً کامیاب ہو جاتے اور طلبہ مغلق کھڑکیاں کھولتے اور نیند سے بیداری کا اعلان کرتے۔ تابش صاحب کئی چکر لگاتے۔ ہمارا وطیرہ عموماً نیکوکاروں کا تھا تاہم کبھی نیند کے ہاتھوں مغلوب بھی ہو جاتے اور معتوب ہوتے۔ نگرانوں کی 'بیداری مہم' سے وہ طلبہ یقیناً بیدار ہو جاتے جو نیند میں ہوں البتہ بعض 'گھامڑ' طلبہ پر ان کی جانفشانی لاحاصل رہتی۔ 'ٹوپی' پہن لینا نیند سے کلیۃً بیداری کا استعارہ تھا، کج رو طلبہ اس حربے کا استعمال بخوبی کرتے اور نگراں کو جُل دینے میں کامیاب ہو جاتے۔ بسا اوقات تو بعض نیکوکاروں نے اپنی شرافت کی آڑ میں اس ہتھیار کا کامیاب استعمال کیا اور مزے لوٹے۔ ایسا بھی ہوا کہ سب نماز کو چلے گئے تو نیند نے پھر انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ تاہم وہ اتنے بے خبر بھی نہیں رہتے کہ دبوچ لیے جائیں۔ ان کی نظریں مسجد سے نکل کر آنے والوں پر ٹکی رہتیں یا تو آگے بڑھ کر وہ اس قافلہ میں شامل ہو جاتے یا پھر نماز بعد کمرے کے دوسرے احباب کے ساتھ محض ٹوپی پہنے کسی کتاب پر گردن ہلانے لگتے اور پھر موقعے کی نزاکت سے نیند کی وادی میں جا پہنچتے۔ طلبہ کی ان تمام کوتاہیوں پر نگراں کی نظر ہوتی جن کے تدارک کی ہر نگراں اپنی بھر کوشش کرتا۔ تابش مہدی صاحب کا رویہ عموماً غیر جارحانہ ہوتا تھا۔ وہ حکمت کو بروئے کار لاتے تھے، کبھی ان سے بے تکلفی کا رویہ اپناتے اور کبھی ان کی کمزوریوں میں خود شریک نہ ہو کر کسی دوسرے طالب علم ساتھی کو ان پر مامور کر دیتے تھے۔ ان کے حصے میں میرے کلاس فیلو رئیس کامل جیسا پختہ کار اللہ والا بھی تھا۔ جو ان دنوں غیر تدریسی سرگرمیوں کا محور تھا۔ مختار اور ندیم بمہور جیسا نابغہ روزگار اور نہ جانے کتنے وحید العصر 'عمر و عیار' تھے جنھیں قابو میں لانا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ بحیثیت نگراں تابش مہدی صاحب کی حکمت اور تدبر نے بالآخر رئیس کامل جیسے پختہ کاروں کو راہِ راست اپنانے پر آمادہ کیا۔

مجبی رئیس کامل بیڑی سے شوق فرماتے تھے۔ تابش صاحب کے خفیہ شعبے سے انہیں اطلاع مل جایا کرتی تھی۔ تابش صاحب نے رئیس کامل سے ہمیشہ محبت اور مروت کا معاملہ روا رکھا جو کافی دنوں تک چلتا رہا اور رئیس کامل پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بھی ان کے شوقِ خاص کا علم رکھتے ہیں۔ ایک روز تابش صاحب کے خفیہ محکمہ سے اطلاع ملی کہ رئیس بیڑی نکال رہے ہیں۔ تاہم اگلے ہی لمحہ پایا گیا کہ وہ بکس سے بیڑی نکال کر توڑ رہا ہے۔ تربیت حکمت اور صبر چاہتی ہے، بحیثیت نگراں تابش صاحب نے یہ کر دکھایا۔ آخرکار رئیس کامل بیڑی سے تائب ہو گئے۔

ذہن میں دو ایسے واقعے محفوظ ہیں جن کا ایک دفعہ خود مجھے شکار ہونا پڑا۔ مولانا محمد عمران فلاحی صاحب کی باؤلی میں یوں تو اکثر چھلانگ لگانے کا موقع میسر آیا اور سرعام آیا۔ تاہم ایسے بھی مواقع آئے جب 'دفعہ ۱۴۴' نافذ کر دی جاتی تھی، پھر بھی اہلِ شوق ادھر کا رخ کر ہی لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ سخت تنبیہ کے باوجود ہم شوقِ تمنا کے ہاتھوں مجبور ہوئے۔ پہل میری تھی یا عطاء اللہ فہد کی، یاد نہیں لیکن ہم دونوں دھر لیے گئے۔ معاملہ زونل نگراں کے سپرد کیا گیا، تابش صاحب کا رویہ یوں بھی جگ ظاہر تھا کہ طلبہ سے بڑی بے تکلفی برتتے ہیں۔ لہٰذا اس موقعے سے انہیں بھی انتظامیہ کے اس تأثر کو غلط ٹھہرانا تھا۔ ہم 'مرغا' بنائے گئے۔ ہم سے قسمیں لی گئیں اور پھر ڈنڈوں سے ہماری تواضع کی گئی۔

دوسرا واقعہ بدایوں کے لالہ بھائی جلیل کی ذات گرامی سے منسوب ہے، جو ہمارے ہاسٹل فیلو تھے، صحت کافی اچھی تھی، کھاتے پیتے گھرانے سے تھے، اکثر ان کے گھی سے ہاسٹل 'گھی زار' بنا رہتا، اور لوگ سمجھ جاتے تھے جلیل بھائی صحت کی آبرو پر فکرمند ہو رہے ہیں، خیر جلیل بھائی نے نماز سے تساہلی برتی، مسجد نہیں گئے اور حسب روایت جب قافلہ نماز بعد ہاسٹل کے قریب تھا، ان کی نظر تابش مہدی صاحب پر پڑی، بچنے کے لیے وہ چارپائی کے نیچے محفوظ ہونا چاہتے تھے، مگر شومیِ قسمت کہ فربہ جسم نے موقع نہیں دیا، وہ زمین بوس چارپائی اور فرش کے بیچ کی درمیانی جگہ میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پائے، بڑی کوشش سے ان کا آدھا جسم ہی سما سکا اور تابش صاحب وہاں حاضر ہو گئے پھر 'ہاو ہو' کا جو عالم ہوگا اس کا بس اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تابش مہدی صاحب کی نگرانی میں طلبہ کے لیے ان کا 'تشجیعی پہلو' قابل ذکر ہے۔ ذہین طلبہ عموماً ان کے اردگرد دیکھے جاتے۔ کسی طالب علم میں وہ زندگی کا کوئی روشن پہلو دیکھتے تو اسے اس کے روشن تر کرنے کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی۔ جامعۃ الفلاح کے مضافات میں جہاں کہیں تابش پسندی کا بازار گرم ہوتا یا کسی ملی مسئلے پر اہل دانش جمع ہوتے تابش صاحب اپنے ہاسٹل کے ننھے خطیبوں، قاریوں اور شاعروں کو موقع ضرور فراہم کرواتے۔ فن تجوید کے تو خیر وہ استاد ہی تھے۔ لہٰذا بعض نکتہ داں اس حوالے سے بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ ان کے قافلے میں مشق سخن کے مبتدی راہرو بھی دیکھے جاتے۔ اس سیاق

میں ذہن میں اب بھی ایک واقعہ تازہ ہے جب میرے ہم سبق شمشاد حسین بجنوری (موجودہ مدیر حجاب) کی تقریری اُپج کو تابش صاحب کی گوہر شناس نگاہوں نے پہچان لیا۔ پھر کیا تھا، ہر مجلس، محفل اور اجتماع میں تابش صاحب کی غزل کی طرح شمشاد کی تقریر کا بھی سکہ رائج ہو گیا۔ فلاح کی مسجد میں یہ نظارہ بارہا دیکھنے کو ملتا، خطیبوں کی لمبی فہرست میں اس وقت سینئروں میں اخلاق بھائی اور جونیر خطیب میں شمشاد حسین سکہ رائج الوقت تھے۔ اسی خطیبانہ ماحول نے ہم میں مولانا آزاد کے خطیبانہ کردار اوران کے جملوں کو ازبر کرنے کا جنون پیدا کیا۔ خیر ایک دفعہ مسجد میں خود اپنی صدارت میں شمشاد کی کرّ وفر والی تقریر پر تابش صاحب کو لہراتے دیکھا۔ ان ہی دنوں بلریا گنج کی کسی قریبی بستی میں تابش صاحب کی ٹیم نے دبش ڈالی تو اس کی گونج سے فلاح کی انتظامیہ کی نیند اڑ گئی، نگراں کی پوری منسٹری متحرک ہو اٹھی، ان طلبہ کی تلاش شروع ہوئی جو شب کو اپنے نگراں کے ہمراہ مدرسے کی چہار دیواری سے باہر دادِ مشاعرہ دے رہے تھے۔ غالبًا ہمارے نگراں کا یہ آزاد پسند رویہ نظم وضبط کے خلاف پایا گیا تھا۔ نگرانِ اعلی جناب مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے بذات خود زحمت کی اور شمشاد کی تلاش میں ہمارے روم میں وارد ہوئے۔ ان کی بھاری بھرکم شخصیت سے ہم کلام ہونا اس وقت ہمارے بس کا روگ نہیں تھا۔ شمشاد نے بھی بس واجبی طور پر ہاں ہوں میں ہی جواب دینے میں بھلائی سمجھی۔ بس اتنا بتایا کہ 'بجنور' سے ہوں اور انہوں نے اپنے مخصوص تنبیہی لہجہ میں صرف اتنا فرمایا کہ ''واپس بجنور بھیج دوں گا'' اور اٹھ کر چلے گئے۔ 'وزارتِ نگرانی' کی سطح پر ہمارے نگراں کے اس آزاد رویہ کا کیا بنا معلوم نہیں، البتہ ہمارے لیے آزادی کے باب میں ''هل من مزيد'' کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

تابش صاحب کی حوصلہ افزائی غیر تدریسی سرگرمیوں میں بھی ہمارے لیے اکسیر حیات تھی۔ اس وقت کھیل اور حفظانِ صحت کا شعبہ بھی فلاح کے دیگر شعبوں کی طرح مثالی کردار کا حامل تھا۔ کبڈی کے معرکے ہوتے، اس میدان میں ہمارے بڑے بھائی عامر اصغر فلاحی، ساجد فلاحی ہلدوانی اور غیاث الدین فلاحی کی عظمت مسلم تھی۔ عامر اصغر اور غیاث بھائی کی وجہ سے عربی چہارم کے سینئر طلبہ نے پوری طلبہ برادری کو دعوت مبارزت دے ڈالی۔ تابش صاحب کو بھلا یہ کیوں کر گوارا ہوتا۔ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے اپنے ہاسٹل کے مخصوص طلبہ کی ایک ہنگامی نشست طلب کی، حسب معمول چنا اور ٹانک (چنا کا پانی) کے ساتھ گرم جلیبیاں منگوائیں۔ ٹیم کے انتخاب کے لیے آپس میں ایک ٹرائل کبڈی رکھی گئی، ادریس، رئیس کامل، خورشید فریہہ، شہنواز مولانی کے ساتھ میں بھی ٹیم کا حصہ بنا۔ معرکہ گرم تھا، ہماری حوصلہ افزائی کے لیے تابش صاحب بہ نفس نفیس میدان میں موجود تھے، بھائی عامر اصغر اور غیاث ہمارے لیے چیلنج تھے۔ بھائی ہونے کے ناطے مجھ خاکسار کو عامر اصغر پر قابو پانے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ سوئے اتفاق کہ میرے جارحانہ رویہ سے عامر اصغر کے سر میں چوٹ آ گئی۔ غیاث بھائی میں بے پناہ

قوت تھی مگر عامر اصغر کی طرح وہ اقبال کے شاہین نہیں تھے۔ بھائی یاسین پٹیل نے عامر اصغر کا اسلوب اپنایا لیکن لا حاصل۔ میدان تابش صاحب کی ٹیم نے مارلیا اور ہم یہاں بھی سرخرو ہوئے۔

تابش صاحب کی تجوید و قرآت کا فیض تو خیر عمومی تھا۔ البتہ ہمارے نگراں ہونے کے ناطے وہ شعر وسخن سے بھی ہمیں بہرہ ور کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اس محاذ پر وہ بڑے فیاض نکلے، دونوں ہاتھوں سے تخلص بانٹتے اور اگر کسی طالب علم سے کوئی شعر موزوں ہوگیا تو جی کھول کر تعریف کرتے اور حوصلہ بڑھاتے تھے۔ یہ پہلو بھی ان کی آزاد پسند طبیعت کی طرح شدت اختیار کرنے لگا۔ ہاسٹل کے مخصوص دائرہ سے شعری سلسبیل کی نہریں دوسرے خطے اور بعد میں پوری طلبہ برادری کو سیراب کرنے لگیں، انتظامیہ نے پھر نوٹس لیا۔ عزت مآب مہتمم جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے عصر کی نماز کے بعد باقاعدہ عزیز طلبہ! کا اپنا مخصوص لہجہ اپناتے ہوئے سواداعظم طلبہ برادری کے خیالی صحرا کی طرف کوچ کرنے والے رویے پر خدشہ کا اظہار کیا اور فکر سلیم کی دعا کی۔

تابش صاحب کی نگرانی کا ایک روشن پہلو ان کا وہ 'ٹوہ' تھا جو ضرورت مندوں تک فیض رسانی پر مبنی تھا۔ ہم نے انہیں اپنی جیب خاص سے کسی کی مدد کرتے تو نہیں دیکھا البتہ وہ حاجت مندوں کے لیے اکثر فکر مند دیکھے گئے۔ وہ نگراں کی حیثیت سے طلبہ کے لیے وظائف کی پُر زور وکالت کرتے اور اس مد میں مرحوم حکیم محمد ایوب صاحب اور دیگر ارباب نظم ونسق سے اپنے ذاتی مراسم کو بھی بروئے کار لاتے۔ اس سے بہت سے طلبہ کی مشکل کشائی ہوتی۔ البتہ ماہانہ رپورٹ میں ان کا رویہ دوٹوک ہوتا۔ 'نماز' کے کالم میں کسی قسم کی رورعایت نہیں رکھی جاتی تھی، اہل خانہ کو صورت حال سے ہمیشہ درست طور پر مطلع کیا جاتا تھا۔

آج جب تقریباً دو دہے بعد ماضی کی ان گمشدہ یادوں میں اپنے نگراں حضرات کی مربیانہ تدبیر کاری، مؤدت، مروت اور ان کے خلوص بے کراں کو ہم یاد کرتے ہیں تو ان کے مستحکم کردار کے نہ جانے کتنے پہلو ایک ساتھ روشن ہوجاتے ہیں۔ یہ ہمارے کردار کے معمار اور ہمارے باغباں ہیں۔ ہم میں جو زندگی کی خوشبو ہے وہ لاریب ان ہی کی تراش خراش کا نتیجہ ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ کتنے معمار و مربی اب خاموش ہیں۔ مرحوم ماسٹر ارشد صاحب اور مرحوم ماسٹر زین العابدین صاحب اپنی تمام تر اچھائیاں سمیٹ کر کائنات کے ازلی نگران اعلی کے حضور حاضر ہیں۔ نیکوکاروں میں اب صرف مولانا محمد عمران فلاحی، مولانا اسمٰعیل فلاحی اور تابش مہدی صاحب باقی ہیں۔ اب نہ جامعۃ الفلاح کی پابندی ہے اور نہ نگرانوں کے تعاقب کا اندیشہ۔ تاہم حق وصداقت پر مبنی قدروں کا جو درس اس نظامِ تربیت سے ملا، دل ودماغ پر اس کی نگرانی آج بھی قائم ہے۔

کفارہ

نسیم احمد غازی فلاحی

(یہ افسانہ جامعۃ الفلاح میں منعقد افسانہ نویسی کے ایک مقابلے کے لیے ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا اور اسے اس مقابلے میں فرسٹ انعام ملا تھا۔ اس کے بعد اس افسانہ کو ماہنامہ الحسنات رام پور (یوپی) میں شائع کرایا گیا۔ اس رسالے سے افسانہ کو نقل کر کے اس پڑوسی ملک کے ایک رسالے/اخبار نے کسی دوسرے شخص کے نام سے شائع کیا، پھر اُس رسالے سے لے کر ہندوستان کے بعض رسالوں نے اسی شخص کے نام سے اُسے شائع کیا، البتہ افسانے کا عنوان تبدیل کر دیا گیا تھا، اور تمہیدی چند جملے تبدیل کر دیے گئے تھے، بقیہ مواد جوں کا توں تھا۔ اب ۴۵ رسال بعد اسے اصل افسانہ نگار کے نام سے دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ ادارہ)

....

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً۔ (الاسراء: ۲۳)

........والدین کے ساتھ احسان کرو یعنی ان کی دل و جان سے خدمت کرو ان کی عزت و احترام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو........ یہاں تک کہ کوئی موقع بھی آئے تو اُف تک نہ کرو......

مولانا صاحب تأثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں آیات قرآنی کی تشریح کر رہے تھے۔ آج ان کے چہرے پر برائے نام بھی تبسم نہ تھا۔ ان کی آواز بھرانے لگی، الفاظ رک رک کر نکلنے لگے، آنکھیں ڈبڈبانے لگیں، آنسو بہہ نکلے۔ ہم طلبہ نے دیکھا کہ مولانا محترم کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی ہے۔

میں سمجھا کہ شاید خشیت طاری ہوگئی ہے۔ واقعی اللہ کا کلام ہے ہی ایسا جس کو پڑھ کر انسان پر خشیت طاری ہوجانی چاہیے۔ میرے تصور کے کانوں میں قرآن کا پرجلال بیان **لَو اَنزلنا ھٰذاالقُرآنَ علی جبل لرأیتہ خاشعاً مُتَصَدِّعاً مِنْ خَشیَۃِ اللّٰہ** ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا'' گونجنے لگا۔ بات شاید اتنی ہی نہ تھی اس لیے کہ مولانا کے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سب حیرت زدہ ہیں کہ آخر مولانا کو ہوکیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی دوران تعلیم نہیں روئے تھے۔

ہم طلبہ کے اصرار پر مولانا نے اپنی داستان کچھ اس طرح بیان کی:

''میں کلکتہ (کولکاتا) کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے والدین شہر میں رہتے تھے۔ والد محترم ایک پرائیویٹ کارخانے میں ملازم تھے۔ پڑھے لکھے تو معمولی سے تھے لیکن میرے والد بہت ہی نیک اور خدا پرست تھے۔ دادا کی بے توجہی کی وجہ سے والد محترم علم سے محروم رہ گئے تھے۔ میری عمر ابھی چار سال ہی تھی کہ مجھے ایک اسلامی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ میرے والدین مجھے دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے، اس لیے میں نے ۱۸/سال کی عمر میں عربی زبان سیکھ لی اور عالم دین کی سند حاصل کرلی۔ دینی تعلیم کے دوران میں انگریزی بھی پڑھتا رہا اور والد صاحب کے ایک دوست کی مدد سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ اب میری خواہش ڈاکٹری پڑھنے کی ہوئی۔ میں نے اپنے والد صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ والد صاحب ایک کارخانے میں مستری تھے اور انہیں اس زمانے میں ۲۰۰/روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔ لیکن پورے خاندان کا خرچ چلانا تھا اور آئندہ کی بھی فکر کرنی تھی۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ میں کوئی ملازمت کرلوں تاکہ گھر کا انتظام سنبھالنے میں آسانی ہو، لیکن میرا ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔ میں نے ان کی بے حد خوشامد کی۔ آخر کار والد صاحب راضی ہوگئے۔ اب میں نے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ میری والدہ بڑی کفایت شعار اور منتظم تھیں۔ خالی وقت میں وہ موم بتیاں اور اگربتیاں بنا کر خاصے پیسے پیدا کر لیتی تھیں۔ اس طرح ان کو محنت تو بہت کرنی پڑتی تھی لیکن میری تمام ضروریات کو رفع کرتی تھیں، اور تعلیم کے دوران مجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دیتیں۔ فیس وغیرہ کے پیسے تو والد صاحب دے دیتے تھے۔ دوسری ضرورتوں کے لیے والدہ مجھے چپکے سے روپے بھجوادیتیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ والد صاحب بھی میرے اخراجات کے لیے اوور ٹائم کام کرتے۔ اس طرح ان کو مزید روپے مل جاتے تھے۔ میں نے پانچ سال میں ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر لی، لیکن ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران میں اسلامی شعار بالکل بھول چکا تھا۔ اس لیے کہ

ماحول بالکل نیااور مغربی ڈھنگ کا تھا۔ میرا ذہن بھی جدید تعلیم اور تربیت سے بے حد متأثر تھا۔ میں نے آخری سال پورے کالج میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے درخواست دینے پر مجھے اسی کالج میں ملازمت مل گئی اور میں ۳۵۰/روپے ماہوار تنخواہ پانے لگا۔ چند سالوں بعد میری آمدنی ۵۰۰/روپے ماہوار ہوگئی۔ والدین نے میری شادی کی فکر کی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی نیک اور دیندار لڑکی سے میرا نکاح کردیں، جو گھر میں آکر ایک اچھی بہو کی طرح رہے، لیکن میری خواہش یہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم یافتہ ہو، جو نئے سماج میں کھپ سکے اور میری طبیعت اور مزاج کے موافق ہو۔ میں نے اپنی پسند کا اظہار ماں کے ذریعے والد صاحب سے کردیا۔ انہوں نے اسے بہت ناپسند کیا لیکن میرے اصرار اور ہٹ دھرمی پر وہ بمشکل راضی ہوگئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ انکار کردیں تو شاید میں من مانی کروں، چنانچہ ایک جدید تعلیم یافتہ لڑکی سے میری شادی ہوگئی۔ شادی کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ والد صاحب کے کارخانے میں ایک گیس کی ٹنکی پھٹنے کی وجہ سے ان کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں، اس لیے اب وہ کارخانے جانے کے بجائے گھر ہی پر رہنے لگے۔ انہیں کارخانے کی جانب سے ایک قلیل رقم معذوری الاؤنس کے طور پر ملنے لگی۔

میری بیوی کو نماز روزے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو نئی تہذیب کی پالی ہوئی آزاد خیال اور تیز مزاج لڑکی تھی۔ اس کی سہیلیوں نے پہلے ہی سے اس کے کان بھر دیئے تھے کہ ساس سسر کی خدمت تمہارا فرض نہیں بلکہ یہ لوگ تو تمہاری خدمت کے لیے ہیں۔ جاہل اور گنوار لڑکیاں ساس سسر کی خدمت کیا کرتی ہیں۔ تم تو صرف اپنے شوہر کی ہوکر رہنا۔ اس وقت میں بھی کسی انگریز سے کم نہ تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ میرے بوڑھے والدین کی خدمت سے یہ پرہیز کررہی ہے تو میں اس پر بہت خفا ہوا لیکن دھیرے دھیرے اس نے مجھ پر ایسا جادو کردیا کہ میں اب اس کی ہر حرکت پر ذرا سا بھی اظہار ناپسندیدگی نہ کرتا۔ اب تو وہ طرح طرح کے الزامات والدین پر لگانے لگی، لیکن مجھے اس سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ میں کچھ نہیں کرپاتا تھا۔ والدین نے مجھ سے اس کی شکایت کی تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ایک روز کی بات ہے کہ والد صاحب رات میں پانی پینے کے لیے اٹھے، نابینا تو تھے ہی ایک اسٹول سے ٹکرا گئے اور اسٹول پر رکھا ہوا دودھ کا برتن زمین پر آرہا۔ بس پھر کیا تھا، بیگم اٹھیں اور ان کو بری طرح ڈانٹتے ہوئے کہا، ''تمہیں شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے، چھوٹے منے کا دودھ رکھا ہوا ہے اور چاہتے ہو کہ چپکے سے خود پی لو، خبردار، جو آئندہ ایسی حرکت کی!'' میری والدہ بھی جاگی ہوئی تھیں، انہوں نے بڑے نرم لہجے میں کہا، ''نہیں بیٹی ایسا نہ کہو، یہ تو پانی لینے اٹھے تھے، سامنے اسٹول تھا دودھ کا برتن گر گیا۔'' ''چپ رہ بڑھیا، لگی تاویلیں

کرنے!'' میری بیوی نے بری طرح جھڑکا۔ میں پڑا پڑا یہ سب دیکھتا رہا لیکن مجھے بیوی کی زبان ذرا بھی بری نہ معلوم ہوئی۔ چند ہفتوں کے بعد ایسا ہوا کہ میرے ماموں آئے اور والد صاحب اور میری والدہ دونوں ان کے ہمراہ میرے ننیہال چلے گئے۔ بیوی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا تو انہوں نے اطمنان کی سانس لی اور کہا، ''اچھا ہوا کہ مصیبت خود ہی ٹل گئی۔'' اور میں نے بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور یہ سوچ کر بیٹھ رہا کہ اچھا ہوا اب روز روز کی دانتا کل کل سے نجات ملی۔ والدین مہینوں سے ماموں کے یہاں رہ رہے تھے۔ اب ہم آرام سے جیسے چاہتے رہتے۔ اس واقعے کو تین سال گزر گئے۔ ایک بچے کی ولادت کے بعد میری چہیتی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ میرے لیے بڑی ہی مصیبت کا سامنا تھا۔ میری زندگی سنسان ہوگئی اور میں اکثر کھویا کھویا رہنے لگا۔ میرے ایک مخلص دوست تھے، انہوں نے جلد ہی ایک غریب گھرانے میں میری شادی کرادی۔ یہ بیوی نماز روزے کی پابند اور بڑی ہی دیندار ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہے۔ صبح کو جب میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہتا تو یہ قرآن کی تلاوت میں مشغول ہوتی۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور میری بیوی قرآن کی تلاوت کر رہی تھی، اچانک وہ اسی آیت پر پہنچی جو تمہارے سامنے ہے یعنی وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔۔۔ تو میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام واقعات آگئے جو پہلے گزر چکے تھے، اور میرے ساتھ میرے والدین نے جو حسن سلوک کیا تھا اور جو زحمتیں میرے لیے گوارا کی تھیں وہ سب ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا ''ہائے میرے والدین'' اب اتنے دنوں بعد مجھے ماں باپ کی یاد آئی، میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میری بیوی دوڑی ہوئی آئی، وہ یہ سمجھی کہ شاید مجھے کوئی تکلیف ہوگئی ہے لیکن دریافت کرنے پر میں نے اس کو پورا قصہ جلدی جلدی سنا دیا۔ اب مجھے بڑی بے چینی ہوئی کہ میں اپنے والدین کو پاؤں۔ میں دوسرے ہی دن اپنے ماموں کے وہاں گیا لیکن وہاں پہونچنے پر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ والدین مہینوں پہلے گھر جانے کے بہانے وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بے چارے کہاں ہوں گے۔ میں فوراً ہی اپنے والد کا فوٹو لے کر جو کہ کارخانے میں کھینچا گیا تھا، تھانے گیا، اور وہاں فوٹو دے کر ایک رپٹ لکھوادی۔ کئی اخباروں میں بھی فوٹو کے ساتھ خبر چھپوائی۔ ادھر ادھر کئی آدمی بھی دوڑائے۔ اب مجھے رات بھر نیند نہ آتی۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتا کہ میرے والدین مل جائیں۔ ایک دن ایک پولیس والا آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ جو شکل آپ نے لکھوائی ہے اسی سے ملتی جلتی شکل کا ایک بوڑھا آدمی فلاں جگہ قبرستان میں دیکھا گیا ہے۔ میں فوراً ٹیکسی کر کے وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ سامنے ایک بوڑھا شخص ایک قبر پر بیٹھا اللہ

سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ میں قریب پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص میرے والد تو نہیں، البتہ ان کے ایک ہم شکل دوست تھے۔ میں ان کے قدموں پر گر پڑا اور ان سے اپنے والدین کا قصہ سنا سنا کر ان کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ ان صاحب نے جنہیں ہم چچا کہا کرتے تھے نگاہ اٹھائی اور دو قبروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''بھائی اکرم! اور بھابھی زبیدہ! دیکھو تمہارا لاڈلا ڈاکٹر آیا ہے''۔ اکرم میرے والد اور زبیدہ میری والدہ کا نام تھا۔ چچا جان کے منھ سے یہ بات سن کر میں اوندھے منھ قبر پر گر پڑا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا''۔

ہم مولانا کی باتیں ٹکٹکی لگائے سن رہے تھے، اتنا کہہ کر مولانا صاحب خاموش ہو گئے۔ میں نے مولانا کی طرف دیکھا اور ساتھیوں کی طرف بھی کہ سب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ مولانا نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا، ''میں چچا جان کو گھر لایا، ان سے لپٹ لپٹ کر رویا، اور ان سے معافی مانگی، اور نہایت خلوص کے ساتھ ان کی خدمت کی ________ شاید اسی سے والدین کی روح کو کچھ سکون مل سکے ________ لیکن بوڑھے باپ اور بوڑھی ماں جو مجھے ملے تھے، ان کے لیے میں کیا کر سکا؟ اب کہاں موقع تھا؟'' مولانا صاحب اتنی بات بھی صاف صاف نہ بیان کر سکے تھے کہ ان کی آواز پھر بھرا گئی، وہ رونے لگے، بہت روئے، ''ان آیات الٰہی کی تشریح کرنے کا مجھے حق نہیں پہونچتا!!''

''آخر میں نے علم دین کا مطالعہ دوبارہ شروع کیا۔ جب ایک حد تک اعتماد ہو گیا تو آپ کے اس مدرسے میں تدریس کے لیے درخواست دی، خدا کا شکر ہے کہ وہ منظور بھی ہو گئی۔ شاید اس طرح سے میں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر سکوں ________''

چپراسی نے گھنٹے پر دو ضربیں لگائیں، اور مولانا سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ہم انہیں دیکھتے رہ گئے۔

خدا جانے ترا دور ہلاکت آئے گا کب تک

عارف آئمی (**احسان الحق فلاحی**، استاذ جامعۃ الفلاح)

یہودی سودخوارو! بے قصوروں پر جفا کب تک
ضعیفوں بے کسوں پر ظلم کی یہ انتہا کب تک

ڈرو قانون فطرت سے کہ یہ بھی اک حقیقت ہے
تمہارا کرّ وفر کب تک تمہارا دبدبہ کب تک

یہودی ظالمو! خونِ شہیداں رنگ لائے گا
بچا پائے گا تم کو فتنۂ ومکر و دغا کب تک

الٰہی اہل غزہ کو عطا کر غلبہ و نصرت
رہے گی سر پہ ان کے ظلم کی کالی گھٹا کب تک

مسلمانو! نماز عشق ادا کرنے چلو غزہ
یہاں کرتے رہو گے تم مناجات ودعا کب تک

ہماری غیرت دینی کو آخر کیا ہوا لوگو
رہے گا قدس پر قابض یہودی بے حیا کب تک

یہودی فتنہ گر مٹنا ہے تجھ کو تیغ مسلم سے
خدا جانے ترا دور ہلاکت آئے گا کب تک

مبارک اہل غزہ کو ثبات وصبر و جانبازی
ٹھہر پائے گا ان کے سامنے دشمن بھلا کب تک

سعودی حکمرانو! ہوش میں آؤ ڈرو رب سے
تمہارا دشمنان دین سے عہد وفا کب تک

حکومت پر نہ ہو نازاں حکومت عارضی شئی ہے
بنے بیٹھے رہو گے ملک کے فرماں رواں کب تک

حرم رسوا ہوا کتنا تمہاری کم نگاہی سے
چلے گا دین سے غداریوں کا سلسلہ کب تک

حرم کے پاسبانو! ننگ ملت ننگ دیں تم ہو
حرم کی آڑ میں دیتے رہو گے تم دغا کب تک

ہوئے ہو آج تم کیوں حق کی ہر آواز کے دشمن
بنو گے دین وملت کے تئیں تم باوفا کب تک

ہو جتنی جلدی ممکن چھوڑ دو شیطان اکبر کو
بنائے رکھو گے امریکہ کو اپنا خدا کب تک

چٹا دیں دھول امریکہ کو گر ہم ایک ہو جائیں
دکھاتا ہے خدا ہم کو یہ عہد جاں فزا کب تک

دعا عارفؔ کی ہے یارب یہ امت ایک ہو جائے
لڑائی جھگڑوں میں ہوتی رہے گی یہ فنا کب تک

غزل

عزیز نبیل (فلاحی)، قطر

سنو مسافر! سرائے جاں کو تمہاری یادیں جلاچکی ہیں
محبتوں کی حکایتیں اب یہاں سے ڈیرا اٹھاچکی ہیں

وہ شہرِ حیرت کا شاہزادہ گرفتِ ادراک میں نہیں ہے
اس ایک چہرے کی حیرتوں میں ہزار آنکھیں سماچکی ہیں

ہم اپنے سر پر گزشتہ دن کی تھکن اٹھائے بھٹک رہے ہیں
دیارِ شب! تیری خواب گاہیں تمام پردے گراچکی ہیں

بدلتے موسم کی سلوٹوں میں دبی ہیں ہجرت کی داستانیں
وہ داستانیں جو سننے والوں کی نیند کب کی اڑاچکی ہیں

وہ ساری صبحیں تمام شامیں کہ جن کے ماتھے پہ ہم لکھے تھے
سنا ہے کل شب تمہارے در پر لہو کے آنسو بہاچکی ہیں

کہاں سے آئے تھے تیر ہم پر، طنابیں خیموں کی کس نے کاٹیں
گریز کرتی ہوائیں ہم کو تمام باتیں بتاچکی ہیں

دھوئیں کے بادل چھٹے تو ہم نے نبیلؔ دیکھا عجیب منظر
خموشیوں کی سلگتی چیخیں فضا کا سینہ جلاچکی ہیں

غزل

اشتیاق دانش (فلاحی)،
پروفیسر اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد۔نئی دہلی

کیوں فضائے عرش کو تیرا جہاں سمجھا تھا میں
کیوں درودیوار کو اپنا مکاں سمجھا تھا میں

میں جہانِ آدم خاکی کا پیغمبر بھی ہوں
کیوں خود اپنے سچ کو بھی راز نہاں سمجھا تھا میں

دیدۂ بینا بھی تھا اور ذہن نکتہ رس بھی تھا
پرچم دشمن کو پھر کیوں بادباں سمجھا تھا میں

یا بصیرت کی کمی تھی، یا تھی نادانی مری
وسعت دریا کو بحر بیکراں سمجھا تھا میں

کیوں بنایا دوست آخر آزر اصنام کو
بت شکن کو دشمن ایمان وجاں سمجھا تھا میں

بے وزن ہونا ہی تھا آخر زمانے میں مجھے
یاد ماضی کو جو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

دیکھنا لیکن وہ کتنا خوش نوا ہے دوستو
ہاں وہی بلبل کہ جس کو بے زباں سمجھا تھا میں

کیا تعجب کہ بہت منزل سے ہوں بھٹکا ہوا
خودفریبی کو نشانِ کارواں سمجھا تھا میں

دیکھئے دانش مگر میری یہ نادانی ذرا
بزم مہرومہ کو اپنا آسماں سمجھا تھا میں

غزل

بنا کے وہم وگماں کی دنیا حقیقتوں کے سراب دیکھوں
میں اپنے ہی آئینے میں خودکو جہاں بھی دیکھوں خراب دیکھوں

یہ کس کے سائے نے رفتہ رفتہ اک عکس موہوم کر دیا ہے
عدم اگر ہے وجود میرا تو روز وشب کیوں عذاب دیکھوں

بدل بدل کے ہر ایک پہلو، فسانہ کیا کیا بنا رہا ہے
بہت سے کردار آئے ہوں گے، مگر کوئی انتخاب دیکھوں

یہ میرے ساتھی ہیں، پیارے ساتھی، مگر انہیں بھی نہیں گوارا
میں اپنی وحشت کے مقبرے سے نئی تمنا کے خواب دیکھوں

میں چاہتا ہوں بدل دوں منظر پرانے نقش ونگار سارے
کہ سرحد جسم وجاں سے آگے نیا کوئی اضطراب دیکھوں

ڈاکٹر عمیر منظر،
اسسٹنٹ لکچرر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،
لکھنؤ کیمپس

غزل

ان کا نہ ہو جو ساتھ تو جنت حرام ہے
یہ ہے اگر عطا تو عطا کو سلام ہے

وہ مائل کرم ہو تو گونگا بھی ہے کلیم
آجائے جب جلال مجالِ کلام ہے

محدود مت کرو اسے بس ایک نام تک
جس نام سے پکارو وہی اس کا نام ہے

اظہار کے بغیر اگر منکشف نہ ہو
تو یہ سمجھ لو عشق ابھی ناتمام ہے

ناداں عبث خیال سزائے خطا کا ہے
یہ ہے نماز عشق جو لمبا قیام ہے

ہم سے نہ ہو سکے گا کبھی اس میں قیل وقال
یہ تم ہو کہہ رہے ہو کہ سودائے خام ہے

ق

گنجائش کلام کہاں ہے پھر اس کے بعد
اتنی سی بات کافی ہے یہ اس کا کام ہے

ملتا ہے ترش روئی میں شاکرؔ مزا اسے
ہم بھی اسی میں راضی ہیں جس میں وہ رام ہے

شاکر الاکرم شاکرؔ
ناگپور

''فسوں''

(ایک تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر محمد افضل فلاحی، بلریا گنج (رکن شوریٰ جامعۃ الفلاح)

۱۹۸۰ء کے بعد اردو فکشن میں غضنفر علی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ غضنفر علی ۹؍مارچ ۱۹۵۳ء میں چوراؤں گوپال گنج بہار کے ایک معروف و مشہور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے حاصل کی۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم گوپال گنج سے مکمل کی۔ یہیں سے ۱۹۷۳ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اے ایم یو علی گڑھ کا رخ کیا۔ ایم اے (اردو) کے بعد آپ نے ''شبلی نعمانی کے نظریات'' کے موضوع پر اپنا علمی و تحقیقی مقالہ مکمل کیا، جس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔ آپ ہائی اسکول سے ہی اردو ادب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اپنے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ لیکن بہت جلد شعر و شاعری ترک کر کے فکشن کی طرف راغب ہو گئے۔ افسانہ، ڈرامہ اور تنقید جیسی تمام اصناف ادب میں طبع آزمائی کی، اور پھر ''حیرت فروش: افسانوی مجموعہ''، ''کوئلے سے ہیرا-ڈرامہ''، ''مشرقی معیار نقد-تنقیدی جائزہ'' جیسی تصانیف سے اردو فکشن کی دنیا میں بہت جلد اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سب سے آخر میں ناول نگاری کی طرف رخ کیا، اور متواتر آٹھ ناولوں کی اشاعت سے اپنے معاصرین میں ایک منفرد و ممتاز مقام حاصل کیا۔

قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے ناولوں کے بعد یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ناول کی تخلیق، تحقیق اور تنقید کا کام مدھم پڑ گیا ہے، اور ایک لمبے عرصے تک مسلسل خاموشی بھی بنی رہی لیکن ۱۹۹۰ء کے آس پاس اردو کے اہم ناول عبدالصمد کا ناول ''دو گز زمین-۱۹۸۸ء''، پیغام آفاقی کا ناول ''مکان-۱۹۸۹ء'' اور غضنفر کا ناول ''پانی-۱۹۸۹ء'' وغیرہ جب منظر عام پر آئے تو ایسا یقین ہونے لگا کہ اردو ناول نگاری میں ایک نشاۃ ثانیہ ہونے جا رہا ہے۔ ''پانی'' کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت نے غضنفر کے اندر مزید حوصلہ، امنگ اور خود اعتمادی پیدا کی، جس سے انھوں نے پے در پے کئی ناول لکھ ڈالے۔ ان میں ''کینچلی ۱۹۹۳''، ''کہانی انکل'' ۱۹۹۷ء، ''دویہ بانی'' ۲۰۰۰، ''فسوں'' ۲۰۰۳، ''وشو منتھن'' ۲۰۰۴، ''مم'' ۲۰۰۷،

''شوراب'' ۲۰۰۹ وغیرہ اہم تخلیقات ہیں۔انہوں نے کمزور، دبے کچلے اور غریب طبقے کے احساسات، ان کے استحصال اور ذات کے کرب وغیرہ کو ان ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔غضنفر نے اہل اقتدار کے ظلم وستم ، کرپشن اور ناجائز اجارہ داری وغیرہ کو بھی ان ناولوں میں پوری ہنرمندی کے ساتھ استعاراتی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔یہ سبھی ناول اپنے موضوعات کی ندرت اور تازگی بیان کی وجہ سے اردو ناول کی دنیا میں بہت جلد مقبول عام ہو گئے۔

غضنفر کے ناولوں میں ''فسوں'' ایک اہم تخلیق ہے، جو ۲۰۰۳ میں منظر عام پر آیا۔اس ناول کا پلاٹ اور تانا بانا اے ایم یو کیمپس ہے جس میں جدید نسل کے جذبات ، احساسات اور سوچ وفکر کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول میں چند مخلص نوجوان مختلف طریقوں سے اپنی یونیورسٹی کے طالب علموں کے اندر احساس بیداری پیدا کرنے اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ لوگ اپنے ساتھ ساتھ معاشرے کو بھی بدلنا چاہتے ہیں اور پورے سماج سے برائی ، کرپشن اور بدعنوانی کو باہر نکال پھینکنا چاہتے ہیں۔لیکن جب جدیدیت سے مغلوب یہ نوجوان حقیقت کا سامنا کرتے ہیں تو صرف ٹوٹ کر بکھرتے ہی نہیں ہیں بلکہ پوری سرکل ایک طرح سے ذہنی الجھن وکشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور دنیا کی عظیم تاریخ اپنے ہاتھوں سے لکھنے کا عزم رکھنے والے یہ نوجوان کس قدر بے بس اور مجبور ہو کر اپنی آئیڈیل منزل مقصود سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور پھر روزگار اور زندگی کے جھمیلوں میں گرفتار ہو کر حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔اس پوری کیفیت اور پس منظر کو غضنفر نے روداد کی شکل میں ترتیب دینے کی سعی کی ہے۔اختصار کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کا موضوع کرپشن کے خلاف تحریکی انداز میں سامنے آنے والے چند جوشیلے، روشن خیال اور ترقی پسند تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کارکردگیوں کی ناکامی اور انسانی خوابوں کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا المیہ ہے۔

غضنفر نے ناول نگاری کی عام روش سے انحراف کرتے ہوئے ''فسوں'' کے کردار عشام ، راحت ، محفوظ بھائی ، زینہ ، انصار ندیم ، جنید ، تبریزی ، عالم بھائی ، خورشید ، نوید حبیب ، نقوی وغیرہ کے عمل سے یہ باور کرایا ہے کہ انسان کو یکسانیت سے نفور ہے اور اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ مستقل جاری رہتا ہے۔ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعہ اے ایم یو علی گڑھ کیمپس کے ادبی ذوق ، داخلی سیاست ، تعلیمی معیار ، یونیورسٹی کے شب وروز کے حسین مناظر ، طالب علموں کی فکر وسوچ اور ان لوگوں کے سرگرم رضا کار کی حیثیت سے کچھ کر گزرنے اور انسانی خدمت خلق کے جذبے کو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ناول کے تمام کردار بعد میں سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں، اور روزافزوں بڑھنے والی ناانصافیوں، ظلم وستم ، کرپشن ، اور منفی طرز فکر کے خلاف آواز بلند کرنے اور اپنے جذبات ، خیالات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کے لیے ایک ''لائٹ'' نامی اخبار جاری کرتے ہیں۔چونکہ یہ افراد روشنی

کی تلاش اور زندگی کی تاریکیوں کو دور کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ اس مقصد کی مناسبت سے اخبار کا نام ''لائٹ'' رکھا جاتا ہے۔ یہ ''لائٹ'' اخبار اپنے پروگرام کے مطابق شائع ہونے لگتا ہے اور ان مسائل پر گفتگو کرتا ہے جس سے معاشرہ دوچار ہے۔ ظلم و ناانصافی اور سماجی ناہمواری کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، اور ان اشوز پر بحث کرتا ہے جن سے سماج پر ایک غیر اخلاقی فضا قائم ہو چکی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اخبار معاشرتی حقیقت کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس کی روز افزوں مقبولیت انتظامیہ، ذی اقتدار افراد اور سیاسی حلقوں کے لیے خطرہ کا نشان بن جاتی ہے۔ نتیجتاً اسے بند کروا دیا جاتا ہے۔

تمام کردار پھر بھی ہار نہیں مانتے اور خود کی زندگی، توانائی اور احساس بیداری برقرار رکھنے کے لیے ''بوم کلب'' قائم کرتے ہیں۔ جس میں رات رات بھر جاگ کر تمام مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ شعر و شاعری اور افسانوں کی بزم سجائی جاتی ہے اور سر جوڑ کر یہ سوچنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آئندہ کے لیے کس طرح کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اسی بیچ دھیرے دھیرے ایک ایک کردار روزگار کی تلاش اور گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے غائب ہوتے چلے جاتے ہیں، ایسا عام زندگی میں دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ جب غم روزگار ستاتا ہے تو غم عشق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اس ناول کے تمام کردار اپنے عہد کے مسائل اور روزگار سے مجبور ہو کر منتشر تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کرداروں کے اندر تعلیمی سفر کے دوران آئی صداقت اور خلوص کی شعائیں کہیں نہ کہیں موجود رہتی ہیں۔ ظاہری طور پر تو زندگی کے اس جبر کو خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں جس سے وہ وقتی طور پر دوچار ہیں لیکن کہیں نہ کہیں وہ تحریکی احساسات اور جذبات جو طالب علمی کے زمانے میں اندر جاگ اٹھے تھے وقفہ وقفہ سے چنگاریوں کی شکل میں باہر نکلنے کو بیتاب ہو اٹھتے ہیں۔

''فسوں'' کو دلچسپ، پُر اثر اور قابل مطالعہ بنانے کے لیے غضنفر نے مختلف تجربے کئے ہیں۔ ایک ساتھ کئی کئی لہجوں کی جھلک ملتی ہے۔ الگ الگ موقعوں کے لیے الگ الگ اسلوب کا التزام ہے اور ان کے اسلوب میں ندرت اور جاذبیت بھی ہے۔ ناول پڑھتے وقت قاری کو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ناول نگار کو پیکر تراشی اور قصہ گوئی پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ہر بدلتا ہوا منظر اپنے ساتھ اپنی تکنیک لے کر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چست فقرے اور انشائی ٹکڑے ناول کی جان ہیں۔ حسن مزاح بھی ناول نگار کے یہاں خوب ہے۔ جس سے ماحول کو شگفتہ اور پرلطف بنانے میں مدد ملتی ہے۔ جابجا اشعار کی شمولیت بھی زبان میں مٹھاس پیدا کرتی ہے۔ کئی پیکر تو مکتوب کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں جس سے ناول میں ایک نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ منظر ناموں، مکالموں، جغرافیائی مناظر اور جزئیات نگاری کے ساتھ دخیل راوی کو بھی فنکارانہ شعور کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان ہی خوبیوں کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''فسوں'' اکیسویں صدی کی اردو ناول نگاری میں ایک قابل قدر اور مفید اضافہ ہے۔

تعارف وتبصرہ

اسعد بدایونیؔ بحیثیت شاعر

مصنف: محمد رضوان خان

صفحات: ۱۷۱/، **قیمت:** ۱۵۰/روپے

ناشر: ادب پبلشنگ ہاوس، دہلی

مبصر: عشرت خاتون فلاحی

زیرنظر کتاب ''اسعد بدایونیؔ بحیثیت شاعر'' محمد رضوان خان فلاحی کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر مصنف کو اردو اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جاچکا ہے۔ اسعد بدایونیؔ 1980 کے بعد کی اردو شاعری کا ایک اہم اور معتبر نام ہے، اسعد بدایونیؔ کو اپنے توانا لہجے، انوکھے تیور اور ترکیب سازی کی نرالی ہنرمندی کے سبب حلقۂ ادب میں محبوبیت حاصل ہے۔ اسعد بدایونیؔ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے داستانی غزلوں کو غزل کے لب ولہجے میں اپنے طور پر نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے جن میں الفاظ کے دروبست اور مصطلحاتِ غزل بھی جدا ہیں۔

یہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ باب اول حالات زندگی، دوم اسعد بدایونیؔ کی غزل گوئی، سوم اسعد بدایونیؔ کی نظم نگاری، چہارم اسعد بدایونیؔ کے معاصر شعراء۔ باب دوم اس اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اسعد بدایونیؔ کی غزل گوئی، داستانی غزل اور جدید غزل کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، باب چہارم تمام ابواب میں اس اعتبار سے جدا ہے کہ اس میں معاصر شعراء کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اسعد بدایونیؔ کی انتیس '۲۹' شاہکار غزلوں کا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اسعد بدایونیؔ پر پہلی تصنیف ہے جسے مرجع کی حیثیت حاصل ہے اور مصنف نے اسے خوب تر بنانے کی ایک اچھی کوشش کی ہے، جو قابلِ قدر اور لائق ستائش ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اسعد بدایونی پر لکھی گئی پہلی مونوگراف 'monograf' کی شکل میں کوئی قابلِ قدر تصنیف منظرِ عام پر آئی ہے جس میں اسعد کو بطور شاعر دنیائے ادب میں متعارف کرایا گیا ہے۔ 'اسعد بدایونیؔ بحیثیت شاعر' محمد رضوان خان کی پہلی اور ایک اچھی کاوش ہے، جسے یقیناً ادبی حلقوں میں سراہا جانا

چاہیے۔اس کا سرِ ورق جاذبِ نظر، دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔اہلِ علم اسے ضرور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

شکستہ خاطر

شاعر: ڈاکٹر راشد اعظمی

صفحات: ۱۷۴/، **قیمت**: ۱۰۰/روپے، **اشاعت**: ۲۰۰۸ء،

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶

مبصر: سعید اختر اعظمی

سخنوری صرف لفظوں کے دروبست اور حروف کے ارتباط کا نام ہی نہیں، یہ مسائل حیات کی آئینہ دار بھی ہے۔ یہ غم جاناں اور غم دوراں دونوں کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ یہ کلی کے چاک پیراہن اور خوشبو کے بکھرنے پر گفتگو کرتی ہے، تو بھنور اور ساحل کے مسائل کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔ڈاکٹر راشد اعظمی غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیروں میں ہیں اور اسے تمام تر لوازمات کے ساتھ برتنے پر یقین رکھتے ہیں۔اُن کے یہاں فراقِ یار شامِ زندگی سے عبارت ہے تو وصالِ محبوب چمن آرائی کا نام ہے۔یوں وہ کشت سخن میں متنوع لفظوں کے گل بوٹے کھلاتے رہتے ہیں۔

''شکستہ خاطر'' ڈاکٹر راشد اعظمی (ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی فلاحی) کا اولین سخن بیانیہ ہے، جس میں رومان اور عہد حاضر کی جلوہ گری شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔بطور نمونہ یہ اشعار ؎

تیمّم ہے تمہاری یاد، لیکن — تم آؤگے تو سمجھوں گا وضو ہے
ابھی سوئی ہوئی ہے جنگ کی دیوی لہو پی کر — خموشی ہے فضاؤں میں، کہیں ماتم نہیں ہوتا
بہاروں نے دلوں کے زخم سارے سبز کرڈالے — جنون شوق صحرا میں کوئی ناکام آیا ہے
ختم ہوتی نہیں ذات میاں پتوں کی — ٹوٹ کر روز درختوں سے گرا کرتے ہیں
دیکھا جو چوٹ کھاکے کمیں گاہ کی طرف — اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

مذکورہ بالا آخری شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ شعر دیکھئے ؎

خنجر لگا تو دیکھا کمیں گاہ کی طرف — بیٹھے ہوئے رفیق ملے میری گھات میں

صفحہ ۱۰۴/کی غزل پر نظریں دوڑاتے ہوئے حفیظ میرٹھی کی غزل 'چاہے تن من سب جل جائے، سوز دروں پر آنچ نہ آئے' بے ساختہ یاد آجاتی ہے، بطور نمونہ یہ دو اشعار ؎

کعبہ ٹوٹے پھر بن جائے — دل ٹوٹے پر جڑ نہ پائے
زخموں کی سوغات ملے تو — شعروں کا دفتر کھل جائے

'ملے گی مے مجھے کتنی بتاؤ'، 'آکے چپکے سے جگا جاتا ہے'، اور 'قبا جب چاک ہوجائے کلی کی'، ایسی غزلیں ہیں جنہیں قارئین کے مکرر ارشاد کی عملی تصویر بنادیا گیا ہے۔آراء کی بیساکھی سے عاری مجموعے میں یادوں کے روزن کھول کر انتظار کرنے والوں کے لیے راشد اعظمی کا یہ شعر حوصلہ دیتا ہے ؎

مری زندگی میں کم ہے، جو ملا نشاطِ غم ہے　　　تری یاد محترم ہے، کوئی کیسے بھول جائے

القلم (مجلة علمية أدبية)

ادارت: محمد اکمل فلاحی

صفحات: ۶۰/ **قیمت**: ۱۰/روپے

ناشر: **معمل اللغة العربية**، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

مبصر: ابوالاعلی سید سبحانی

طلبہ جامعۃ الفلاح کے سہ ماہی عربی ترجمان 'القلم' کا دوسرا شمارہ زیرنظر ہے۔ اس شمارے میں مدیر مجلّہ محمد اکمل فلاحی کے پرمغز اداریے کے علاوہ متعدد اہم تحریریں شامل ہیں۔ ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی اور صدر مدرس شعبہ اعلی مولانا انیس احمد فلاحی مدنی کے تأثرات کے علاوہ اہم مضامین میں ذکی الرحمٰن فلاحی، ثاقب علی مکی، مصباح الباری فلاحی، عمار جاوید خان، محمد عرفان بٹ، نعمان بن قطب کے مضامین ہیں۔ اس مجلّہ کا ایک اہم حصہ 'ریاض الطلاب' کے نام سے ہے، جس میں مختصر، دلچسپ اور مفید چیزوں کی اشاعت پیش نظر ہے۔ امید کہ یہ مجلّہ طلبہ کے اندر عربی زبان سے دلچسپی پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوگا۔

غزہ تاریخ فلسطین کا ایک اہم باب

(خصوصی شمارہ سہ روزہ دعوت ۲۵/۱۰/۲۰۱۴ء)

ادارت: پرواز رحمانی، شفیق الرحمٰن، ابوالاعلی سید سبحانی

صفحات: ۲۰۸/ قیمت: ۵۵/روپے

مبصر: تنویر آفاقی فلاحی

یہ سہ روزہ دعوت کا خصوصی شمارہ ہے جو ۲۵/ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں بشمول اداریہ ۲۲/ مضامین ہیں، جو مسئلہ فلسطین کی تاریخ، اس کی شرعی حیثیت، صہیونی عزائم اور مشرق وسطی، غزہ کی تاریخ اور وہاں کی اسلامی تحریکات کا تعارف نیز فلسطین سے متعلق اہم ترین موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ فلسطین کے خلاف یہودی وصہیونی جارحیت کا سلسلہ تو مسلسل جاری ہے، لیکن اس بار غزہ کے خلاف اسرائیلی محاصرے سے فلسطین، بلکہ اسلام دشمن یا یہودی پرست چہرے ذرا کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ زیرنظر شمارے میں اس سلسلے کا بھی ایک مضمون شامل ہے جو کہ عربی ماہنامہ 'المجتمع' کے ایڈیٹر ڈاکٹر شعبان عبدالرحمٰن کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، عالم عرب کے معروف سیاسی تجزیہ نگار ڈاکٹر فہمی ہویدی اور یاسر الزعاترہ کی تحریریں اور حماس کے سیاسی رہنما خالد مشعل کا ایک تازہ انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مسئلہ فلسطین پر مولانا مودودیؒ کی ایک یادگار تحریر بھی اس میں موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی مسئلہ فلسطین، اور بالخصوص غزہ اور اہل غزہ کی تاریخ، ان کی عزیمت اور ان کے مسائل سے واقفیت کا یہ ایک اہم ذریعہ ہے۔

آپ کے خطوط

الحمدللہ گزشتہ شمارے سے متعلق قارئین کے تأثرات کافی بڑی تعداد میں موصول ہوئے، البتہ صفحات کی قلت کے سبب جملہ تأثرات کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ یہاں معذرت کے ساتھ محض چند خطوط کی اشاعت پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ **مدیر)**

ولی اللہ سعیدی فلاحی، رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند وامیر حلقہ یوپی مشرق

مجلّہ حیات نو کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مضمون نگار حضرات کافی محنت سے اپنی کاوشیں پیش کر رہے ہیں۔ مضامین کا تنوع بھی خوب ہے۔ ویسے اصحاب قلم سے مجلّہ کے لیے مضامین حاصل کر لینا بھی ایک فن ہے جو بین السطور میں صاف نظر آتا ہے۔ مولانا طارق فارقلیط مرحوم پر مضامین کا انتخاب بھی بہت اچھا ہے۔ آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

انتظار نعیم، اسسٹنٹ سکریٹری جماعت اسلامی ہند، ومعروف ادیب وشاعر

جامعۃ الفلاح سے اس کے بانیان کی مخلصانہ کاوشوں، اس کے منتظمین کی بے لوث خدمات، اس کے معروف ومحترم اساتذہ کرام کی جہد مسلسل، اس کے نصاب اور طرز تعلیم نیز مجموعی طور پر جامعہ کے سامنے ہمہ وقت رہنے والے عظیم دینی وملی مقاصد کی بنا پر مجھ کو ہمیشہ دلچسپی، تعلق خاطر اور اس سے محبت رہی ہے۔ چنانچہ فطری طور پر جامعہ کی فکر کی ترویج کرنے والے اس کی انجمن طلبہ قدیم کے ترجمان 'حیات نو' سے بھی آغاز ہی سے دلچسپی ہے۔ ایسا شائد ہی کبھی ہوا ہو کہ برادرم جناب نسیم غازی صاحب کے توسط سے حیات نو ملا ہو اور اس سے استفادہ نہ کیا ہو۔ جب سے رسالہ کی ذمہ داری آپ (ابوالاعلیٰ سید) کے سپرد کی گئی ہے تو اس کے حسن ووقار اور معیار میں خوش کن بہتری کے سبب ایسا ممکن ہی نہیں ہوتا کہ اس سے صرف نظر کیا جاسکے۔ تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء) اپنی دیرینہ روایات کا غماز ہے، بلکہ اس کو آگے بڑھا رہا ہے۔

امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال کی عکاسی کرنے والا اداریہ، اصلاح وتربیت اور حضورؐ کی دعوتی حکمت عملی، اردو تراجم قرآن پر ایک نظر وغیرہ جیسے مفید مضامین کے ساتھ ''ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار'' پر دوستوں کے مضامین ادبِ اسلامی کی اہمیت وافادیت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کرنے والے ہیں۔ اس موضوع کے انتخاب سے آپ نے ایک اہم پوشیدہ حقیقت کی طرف قارئین کو متوجہ کر کے بڑا کام کیا

ہے۔ساتھ ہی شعری حصہ سونے پرسہاگہ ہے۔

جامعۃ الفلاح نے آہستہ آہستہ ایک لمبا سفر طے کرلیا ہے، اس کے فارغین ملک کے مختلف حصوں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی جگہ جگہ علم وفن کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں۔ بہت سے احباب اخلاص اور ذمہ داری کے ساتھ تحریک اسلامی کے پیغام کو عام کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، یعنی جامعۃ الفلاح کے خواب کی تعبیر بن رہے ہیں۔ حیات نو کے اس تازہ شمارے میں آپ نے برادر محترم مولانا طارق فارقلیط فلاحی کی حیات وخدمات پر گوشہ پیش کر کے ایک فرض ہی پورا نہیں کیا، بلکہ جامعۃ الفلاح سے ابھری ہوئی اس عظیم شخصیت کے حوالے سے یہ خاموش اشارہ کیا کہ الحمدللہ جامعہ ملک عزیز میں اسلام کی سربلندی کی جدوجہد کرنے والے کیسے مخلص وباصلاحیت افراد پیدا کررہا ہے۔اس سعادت کے حصول پر جامعۃ الفلاح کوسلام، انجمن طلبہ قدیم اور حیات نو کو مبارکباد۔اللہ کرے یہ پورا کارواں اسی شان کے ساتھ رواں دواں رہے، آمین

<u>**نعیم الدین اصلاحی**، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، بلریا گنج۔اعظم گڑھ</u>

'حیات نو' جولائی تا ستمبر ہمارے سامنے ہے۔محترم ڈاکٹر محی الدین غازی صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ موصوف لکھتے ہیں ''اس مراسلہ کو لکھنے کا محرک یہ بنا کہ حال ہی میں دوران مطالعہ جاہلی دور کا ایک شعر نظر سے گزرا جس میں لفظ مصیبۃ آفت ومصیبت کے بجائے بطور اسم وصف استعمال کیا گیا، مناسب سمجھا کہ قارئین کی خدمت میں اسے پیش کیا جائے تا کہ زیر بحث موضوع میں اس سے مدد لی جاسکے۔شعر اس طرح ہے:

أعاذل قد أطنبت غير مصيبة

فان كنت في غي فنفسك فارشدي

ترجمہ: مجھے ملامت کرنے والی تیری ملامت کا سلسلہ دراز ہوگیا، جبکہ تو برحق نہیں ہے، اس لئے اگر تو گمراہی میں مبتلا ہے تو پھر خود کو راہ راست پر لا۔

اس شعر میں مصیبۃ کا مطلب آفت ومصیبت نہیں ہے بلکہ کہی ہوئی بات میں برحق ہونا ہے۔

یہ شعر جاہلی دور کے مشہور شاعر عدی بن زید العبادی کے مشہور قصیدہ أتعرف رسم الدار من أم معبد کا ہے۔ (حیات نو، صفحہ:۷۴)

مجھے بے حد خوشی ہوئی موصوف نے دور جاہلیت کے ایک شاعر کے ایک شعر کو اپنے حق میں بطور استشہاد ڈھونڈ نکالا۔ یقیناً موصوف کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔اس سلسلے میں چند گزارشات ہیں، امید کہ اس پر توجہ کی جائے گی:

(۱) مصیبۃ کا لفظ کلام عرب کا نہایت ہی مشہور لفظ ہے، قرآن نے بھی اسے جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور مصیبۃ اور آفت کے معنی لیے ہیں اور بالعموم اشعار عرب اور خطبائے عرب بالخصوص ''اعراب'' کے خطبوں میں بھی

وہی معنی لیے گئے ہیں۔ اگر شعراءِ عرب اور خطبائے عرب کے عام استعمال کے خلاف کوئی جاہلی دور کا شاعر یہی استعمال کرتا ہے تو وہ شاذ ہوگا، اور **الشاذ یحفظ و لایقاس علیہ** اور **الشاذ کالمعدوم** کا کلیہ معلوم ہے۔

(۲) ہمارے سامنے جمہرۃ اشعار العرب کے دو نسخے ہیں، ان دونوں نسخوں میں قصیدہ ''اَتعرف رسم الدار من اُم معبدٍ'' موجود ہے۔ ایک نسخے میں اس قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۴۸/ اور دوسرے میں ۴۲/ ہے۔ لیکن دونوں میں یہ شعر موجود نہیں ہے حالانکہ جمہرۃ اشعار العرب کے سلسلے میں ماہرین ادب کا یہ جملہ بڑا معروف ہے ''**لعل القصائد التسع والاربعین التی جمعها ابوزید القرشی فی جمهرة اشعار العرب اصح الشعر القدیم روایة واصدقه تمثیلاً لأسلوبه ومنهاجه** (**تاریخ الادب العربی، حسن زیات،** مطبوعہ فیصل بک ڈپو دیوبند۔)

جمہرۃ اشعار العرب قدیم عربی اشعار کا سب سے مستند مجموعہ اور عربی اسلوب کا نہایت سچا نمونہ ہے۔

اسی طرح الشعر والشعراء اور طبقات الشعراء میں بھی اس کا یہ قصیدہ دیا گیا ہے، مگر وہاں بھی اس کے منتخب اشعار میں یہ شعر جگہ نہیں پا سکا۔

(۳) ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں اس شاعر کا تعارف اس طرح کرایا ہے ''**وکان یسکن بالحیرة ویدخل ا لأریاف فثقل لسانه واحتمل عنه کثیر جداً وعلماء نا لا یرون شعره حجة**'' (**الشعر والشعراء : ۱۳۶** مطبوعہ عالم الکتب، بیروت)

اسی طرح کا خیال محمد بن سلام الجمحی نے بھی اپنی معروف کتاب طبقات الشعراء میں ظاہر کیا ہے۔ لکھا ہے ''**وعدی بن زید کان یسکن الحیرة ومراکز الریف فلان لسانه وسهل منطقه فحمل علیه شئی کثیر وتخلیصه شدیدٌ واضطرب فیه خلف وخلط فیه المفضل .. (طبقات الشعراء لمحمد بن سلام الجمحی)**

ابوالفرج اصفہانی کا خیال بھی اسی سے ملتا جلتا ہے ''**ولیس ممن یعد فی الفحول وهو قروی وکانوا قد أ خذ وا علیه أشیاء عیب فیها، وکان الاصمعی وابو عبیدة یقولان عدی بن زید فی الشعراء بمنزلة سهیل فی النجوم یعارضها ولایجری معها مجراها**'' (**کتاب الاغانی** جلد ثانی ص۔۶۳) اس کے اشعار کیوں حجت نہیں احمد امین کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے، کہتا ہے: ''**کان عرب الحیرة أرقی عقلا ومدنیةً من عرب الجزیرة لتحضرهم ولمجاورتهم مدینة الفرس العظیمة واتصالهم بها اتصالا وثیقا وکان منهم من یعرف اللغة الفارسیة ویجیدها ففی ابن خلدون'' ان عدی بن زید الحیری کان من ترجمة ''برویز ملک الفرس''(فجرالاسلام ص. ۱۷۰)الناشر دار الکتاب العربی. بیروت.**

ابی عمرو بن العلاء کے بیان سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے وہ کہتا ہے ''والعرب لایرون شعره حجة لان ألفاظه لعبت بجدية الشعر والشعراء (ص:۱۲۴، طبقات الشعراء، تصنیف أبی محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبة، حققه وضبطه: الدکتور مفید قمیحہ۔ الاستاد امین الصاوی)

ان اقتباسات کا ترجمہ طوالت کا موجب ہوتا، اس لیے ذیل کے نکات میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

(۱) عدی بن زید دور جاہلیت کے ان شعراء میں آتا ہے جس کا کلام حجت نہیں۔

(۲) چونکہ یہ حیرہ میں رہتا تھا، اور حیرہ مدائن سے قریب تھا اس لیے اس کی زبان پہ فارسی زبان وثقافت کی گہری چھاپ تھی جس کے نتیجے میں وہ عرب کے فطری زبان واسلوب سے بہت دور نکل گیا تھا۔

(۳) اس کے کلام میں آمیزش اور ملاوٹ اس قدر ہے کہ اس کے اصلی اور الحاقی کلام میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے۔

(۴) جاہلی شعراء کی بزم میں ضرور نظر آتا ہے مگر جاہلی شعراء کے مذاق شعری سے بہت حد تک بے گانہ ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

آخر میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں، جو اس مسئلہ پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ مولانا لفظ ''تمنی'' کی لغوی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجھے نہیں معلوم کہ اس لفظ کے اندر بعض لوگوں نے ''قرأت'' کے معنی کہاں سے گھسا دیے ہیں، مجھے اس معنی میں یہ لفظ کلام عرب میں کہیں نہیں ملا۔ حالانکہ یہ عربی زبان کے کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ بعض مفسرین نے اس مفہوم کی تائید کے لیے ایک شعر نقل کیا ہے لیکن اول تو ایک کثیر الاستعمال لفظ کو اس کے معروف مفہوم سے ہٹانے کے لیے ایک غیر معروف شعر کی سند کی کیا وقعت ہے''۔

<u>**رحمت اللہ اثری فلاحی**، مہتمم جامعۃ الفلاح بلریا گنج۔ اعظم گڑھ</u>

حیات نو پابندی سے مل رہا ہے، نئے کالمس 'فکر وآگہی'، 'پرانی یادیں: ہمارے زمانے کا جامعہ'، 'فکر وتحقیق'، 'جامعہ کے لیل ونہار'، 'گوشۂ ادب'، 'تبصرۂ کتب' اور 'اخبار انجمن' تک سبھی کالم اہم اور مفید ہیں۔ 'پرانی یادیں' کالم کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ یہ جامعہ کی تاریخ اور روایات کو محفوظ کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے، میرا مشورہ ہے کہ ایک کالم فارغین جامعہ کے تعارف کا بھی شروع کیا جائے، جس میں مختلف نمایاں فارغین جامعہ کا تعارف ہو، اور ان کی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالی جائے، یہ جامعہ کے تعارف کا بہترین ذریعہ ہوگا۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ 'نامہ وپیام' یا کسی بھی نام سے سوال وجواب کا ایک مستقل کالم شروع کیا جائے جس میں اہم اور معیاری قسم کے سوالوں کا جواب دیا جائے، یہ کالم صرف فارغین جامعہ کے لیے مختص نہ

رکھا جائے بلکہ متعلقین ومحسنین جامعہ کو بھی اس میں شرکت کا موقع فراہم کیا جائے۔ الحمدللہ ادھر حیات نو میں بہت ہی توازن کے ساتھ علمی وتحقیقی اور کچھ عام فہم اور سادہ قسم کے مضامین شائع ہورہے ہیں، اس کو برقرار رکھئے۔ اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔

محمد عمر اسلم اصلاحی، شیخ التفسیر مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر۔ اعظم گڑھ

امید کہ آپ مع رفقاء بخیر وعافیت ہوں گے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ نے حیات نو کو بعض پہلوؤں سے فی الواقع نئی زندگی دی ہے، اس کا ایک قابل ذکر پہلو فارغین جامعہ کے احساسات وتأثرات ہیں۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے، ایک یہ کہ جامعہ کے مختلف ادوار سے وابستہ یادیں نئی نسل تک منتقل ہوں گی اور ان کے لیے آئینہ فراہم ہوگا، جس میں وہ اپنی تصویر دیکھ سکیں گے، نمبر دو یہ کہ متاع گمشدہ کی تلاش کا رجحان پیدا ہوگا۔ اور دوسرا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک مستقل علمی کالم میں مولانا امانت اللہ اصلاحی صاحب حفظہ اللہ کے افادات ہیں۔ یہ افادات قرآن مجید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی صاحب قرآنی علوم کے حوالے سے موجودہ علمی دنیا کی ایک معتبر شخصیت ہیں، اس لیے تفاسیر اور تراجم قرآن پر ان کی آراء کا ایک خاص مقام ہے۔

ڈاکٹر سلیم خان، معروف سیاسی تجزیہ نگار، وادیب وناول نگار (حال مقیم متحدہ عرب امارات)

(تبصرہ بر حیات نو جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء) بھئی ادب اسلامی کے موضوع پر اس قدر فکر انگیز اور سنجیدہ کوشش میری نظروں سے نہیں گزری۔ آپ نے مختلف آراء کو جمع کرکے اس خوبی سے پیش فرمایا کہ قارئین کے لیے مزید غور وفکر کے دروازے کھل گئے۔ ابتداء میں تو مجھے ایسا لگا گویا میں پیش رفت دیکھ رہا ہوں، لیکن خاتمے پر یوں محسوس ہوا کہ آپ اور بھی آگے نکل گئے۔ ماشاء اللہ مبارک ہو۔ میری رائے یہ ہے کہ اس شمارے کو پیش رفت کے سارے قارئین تک پہنچنا چاہئے۔ آپ ادارہ ادب اسلامی کے ذمہ داروں سے پتہ حاصل کرکے انہیں ڈاک سے روانہ کرسکتے ہیں۔ بیرون ملک جو تنظیمیں ادب کی ترویج واشاعت کے لیے سرگرداں ہیں ان تک بھی اس کی رسائی ہوجائے تو اچھا ہے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو اسلامی خطوط پر کام کرتے ہیں۔ ان تک شمارہ ای میل یا ڈاک سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالی آپ کی سعی جمیل کو قبول فرمائے اور آپ کو جزائے خیر سے نوازے۔

محمد اسماعیل فلاحی، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ۔ یوپی

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ کا شمارہ پیش نظر ہے، ماشاء اللہ خوب ہے۔ چند باتیں عرض ہیں:

(۱) ''ہمارے زمانے کا جامعہ'' مشرف حسین صدیقی صاحب کا مضمون اپنے اندر غور وفکر کے مختلف پہلو رکھتا ہے اس عنوان پر اس سے قبل کے مضامین دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔

(۲)'مااصاب من مصيبة في الارض" کے تعلق سے مختلف فضلاء کے درمیان جو گفتگو چل رہی ہے، میرا خیال ہے کہ اب مزید کی ضرورت نہیں ہر پہلو سامنے آ گیا ہے۔

(۳) ڈاکٹر سلیم خان نے اپنے مکتوب میں جو باتیں کہی ہیں وہ صحیح ہیں۔ گزشتہ شمارے کے اداریے کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہی محنت اور جفاکشی اپنے مقصد زیست کے لیے لگن اور اپنے بظاہر روشن مستقبل اور کیریئر کو قربان کر دینے کا جذبہ ہمارے اندر بھی ہونا چاہیے بلکہ ان سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ وہ ان دونوں اداروں (تعلیم اور خدمت خلق) کے ذریعہ جو زہریلا بیج معصوم اور کچے ذہنوں میں ڈال دیتے ہیں اور اس سے جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کا کون انکار کر سکتا ہے۔

(۴) برادر عزیز ومکرم طارق فارقلیط فلاحی کے خصوصی گوشے پر مبارکباد قبول کرو، حق تو یہ تھا کہ ان کے سارے اداریے اور مضامین جو رفیق منزل اور حیاتِ نو کے شماروں میں ہیں وہ سب اس میں شامل کئے جاتے۔

میرا ان سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے، جب وہ جامعہ آتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ میں اپنے گھر پر نہ سو کر مہمان خانہ میں ان کے ساتھ رات گزاروں اور بارہا ایسا ہوا کہ ان کی محبت اور خلوص کے آگے مجھے سپر ڈالنا پڑا، ان کی بہت سی باتیں اور واقعات ذہن میں موجود ہیں لیکن تم نے جتنی جلدی میں مضمون مانگا تھا اس بنا پر ساری باتیں اس میں نہیں آ سکیں۔ جب بھی لکھنؤ جانا ہوتا ان سے ملاقات کئے بغیر آنا ممکن نہیں تھا۔ ان کی محبت، ان کا خلوص، ان کی بے تکلفی اور بغیر کسی تحفظ کے ایک دوسرے کے سامنے اپنے احساسات وخیالات کا اظہار، یہ سب چیزیں اب لکھنؤ میں کہاں ملیں گی۔ جناب انتظار نعیم صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ "لیکن اب (دارالاسلام مولوی گنج لکھنؤ) جانا ہوگا تو نگاہیں طارق فارقلیط صاحب کو نہ ڈھونڈ پائیں گی، نہ دیکھ پائیں گی اور دل کے رنج وغم واضطراب میں مزید اضافہ کریں گی"۔ میں استاد محترم مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی حفظہ اللہ کے اس احساس میں ذرا سے اضافے کے ساتھ برابر کا شریک ہوں "جماعت نے (اور راقم کا اضافہ تعلیمی وملی اداروں نے) اپنے اس طرح کے بہت سے قیمتی افراد کے ساتھ ہمیشہ ظلم کیا ہے۔ ایک انسان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ قیمتی آدمی ہے اور بہت کام کرتا ہے، یہ ضروری ہے نہیں کہ وہ اپنی صحت کی خود فکر کرے۔ دوسرے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ یہ شخص مریض ہے، ہارٹ کا مریض ہے تو ان کی ذمہ داری ہے کہ اس کو ڈاکٹر کو دکھایا جائے، اس کا علاج کرایا جائے، جو لوگ آس پاس رہتے ہیں ان کو اس کی فکر کرنی چاہیے، یہ ان کی ذمہ داری ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو کام کرنے والے ہوتے ہیں وہ رات دن ایک کر کے کام میں لگے رہتے ہیں، اپنی ہڈی گلا دیتے ہیں، اپنا خون جلا دیتے ہیں، جبکہ وہیں کچھ دوسرے لوگ خالی بیٹھے رہتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی کمی ہے اور بہت بڑا خسارہ ہے۔"

طارق فارقلیط صاحب کے بارے میں ایک دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے، ان کی پیدائش ۱۹۵۳ میں نہیں بلکہ جامعۃ الفلاح کے ریکارڈ کے مطابق ۶/جولائی ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ جامعۃ الفلاح میں انہوں نے یکم

فروری ۱۹۶۷ء میں درجہ سوم ابتدائی میں داخلہ لیا۔ والد کا نام چھوٹکن تھا۔ گورکھپور میں اروا بازار کے قریب جتوار پور، بانس گاؤں ان کا آبائی وطن ہے۔ وہ صدر حلقہ ایس آئی او یوپی تھے، جس میں دہلی بھی شامل تھا۔ مشرق ومغرب کی اس وقت تقسیم نہیں ہوئی تھی۔

میرے مضمون میں غلطی سے یہ بات آ گئی ہے کہ میرا تعارف ان سے اُس وقت ہوا جب وہ درجہ آٹھ ثانوی کے طالب علم تھے، وہ درجہ آٹھ کے نہیں، درجہ سات (ہفتم) کے طالب علم تھے۔ اس زمانہ میں ثانوی ہفتم ہی تک تھا۔ ایک بات اور ریکارڈ میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے انہیں ایک بار کمرے میں تنہائی میں روتے دیکھا تھا جو زبانِ حال سے بہت کچھ کہہ رہا تھا، بات اتنی سی تھی کہ ان کے انداز اور ان کی بے باکی برداشت نہ کرسکنے کی بنا پر انھیں پیٹا گیا تھا، یہ ہے وہ انداز جو جبری اور بے باک طلبہ کی جرأت و بے باکی کو ختم کرکے انھیں بزدل اور منافق بنا دیتا ہے۔ خدا جانے تعلیمی اداروں میں یہ گھسا پٹا اندازِ تربیت وتزکیہ کب تک چلتا رہے گا۔

محترم نسیم غازی صاحب کے تجربات ومشاہدات کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں اس دفعہ کے شمارہ میں انہوں نے مولانا اختر احسن اصلاحی برد اللہ مضجعہ کا ایک واقعہ تربیت کے ضمن میں مولانا شہباز اصلاحی نور اللہ مرقدہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ مولانا شہباز صاحب کے حوالہ سے انھیں کا ایک دوسرا واقعہ لکھتا ہوں۔ نسیم غازی صاحب نے ایک دوسرے نگراں کا بھی ان کے حوالہ سے ایک اور واقعہ لکھا ہے۔ وہ عام نگراں نہیں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل تھے۔ میں اس واقعہ کی تفصیل کے علاوہ انھیں کا ایک دوسرا واقعہ مولانا شہباز صاحب کے حوالے سے ''ذکر شہباز'' سے قلمبند کرتا ہوں۔ اساتذہ اور مربی حضرات کے لئے اس میں بڑا سبق ہے۔

اصلاح میں ایک ماسٹر صاحب ہوا کرتے تھے۔ جناب قمر الدین صاحب، مکتب کے استاد تھے، ایک لڑکے نے ان کے ساتھ گستاخی کی، کھڑاؤں چلا کر مار دیا، اساتذہ کی نشست ہوئی اور اتفاق رائے سے اخراج کا فیصلہ ہوگیا، اساتذہ چونکہ اس معاملہ میں بڑے مشتعل اور جوش میں تھے اس لیے مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب نشست میں خاموش رہے، مولانا شہباز صاحب غالبًا اس وقت ابھی طالب علم ہی تھے، مولانا اختر احسن صاحب نے مولانا شہباز صاحب کو بلا کر کہا کیا مدرسہ میں صرف نیک لڑکے ہی رہیں گے؟ ماسٹر صاحب سے گفتگو کیجیے، سمجھایئے، وہ معاف کردیں، اللہ انہیں اجر دے گا۔ اگر وہ معاف کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو وہ لڑکا سب کے سامنے ان سے معافی مانگے گا، اور آئندہ کے لیے ادب واحترام کا یقین دلائے گا۔ ماسٹر قمر الدین صاحب سے مولانا شہباز صاحب کی گفتگو کامیاب رہی، ماسٹر صاحب نے معاف کردیا اور اور اس لڑکے کی تعلیم جاری رہی۔

مولانا شہباز صاحب نے ایک بار مولانا محمد سہول صاحب کا واقعہ سنایا تھا جس کا تذکرہ میں نے ''حیات نو'' میں کیا تھا، وہ واقعہ اسی سے نقل کرتا ہوں۔ شہباز صاحب کی حالت بالکل اسی سے ملتی جلتی تھی اور اسی کی وہ تلقین کرتے تھے:

''شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خلیفہ مولانا محمد سہول بھاگلپوریؒ ایک جید باعمل عالم گزرے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر، وہاں مدرس اور مفتی بھی رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے زمانہ کا واقعہ ہے، عم محترم مولانا محمد شہباز صاحب اصلاحی نے بروایت مولانا حبیب اللہ صاحب رانچوی مرحوم بتایا، ''گرمی کا زمانہ تھا، طلبہ برآمدہ میں سورہے تھے، ایک طالب علم جو ذرا لاپرواہ اور کاہل قسم کا تھا، فجر بعد بھی سویا تھا، ایک بار اٹھایا، اٹھ بیٹھا، دوبارہ سوگیا، دوسری بار اٹھایا لیکن پھر بھی ایسا ہی ہوا، تیسری دفعہ انھوں نے ایک ہلکی چھڑی لگائی۔ طالب علم نے کہا مجھے رات سے بخار ہے۔ یہ سننا تھا کہ مولانا کی حالت ایسی ہوگئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، بالکل تڑپنے والی کیفیت کہ تم رات بھر بخار میں جلتے رہے، مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ مزید یہ کہ میں نے تمہیں چھڑی لگادی، طالب علم حیران کہ کیا کرے، اس نے کہا کہ حضرت، کوئی بات نہیں، کچھ نہیں ہوا، ادھر مولانا کا اصرار کہ تم بھی مجھے ایک چھڑی مارو۔ کسی نے کہا شریعت میں صرف قصاص ہی نہیں، دیت بھی ہے، کچھ مٹھائی منگوایئے اور کھلایئے۔ مولانا نے ایسا ہی کیا، پھر بھی بات یہیں ختم نہیں ہوگئی، بلکہ بعد میں جب تک وہ وہاں رہا، اور اس کے بعد بھی مولانا اس کا خاص خیال رکھتے اور اس سے معافی مانگتے۔ اسی زمانہ کا ایک اور واقعہ ہے۔ امتحان ہونے والا تھا، لڑکے چاہتے تھے کہ ابھی نہ ہو۔ انھوں نے اسٹرائک کردی، وہ بڑی سخت قسمیں کھائے ہوئے تھے اور عام طلبہ سے بھی انھوں نے قسمیں لے رکھی تھیں، مثلاً یہ کہ اگر کوئی طالب علم اس کی خلاف ورزی کرے گا تو جب جب وہ شادی کرے گا اس کی شادی ختم ہوجائے گی اور اس کی بیوی کو طلاق ہوجائے گی وغیرہ۔ مسئلہ کتنا نازک اور پیچیدہ تھا، ایک طرف طلبہ کو انتہائی سخت قسمیں کھلائی گئی تھیں یا انھوں نے ازخود کھا رکھی تھیں، ان کے لیے اس فیصلہ سے دست بردار ہونا آسان نہ تھا، ان کی زندگی برباد ہوئی جاتی تھی۔ دوسری جانب اسٹاف کی یہ رائے کہ طلبہ کے مطالبہ کے آگے جھکنا کمزوری کی علامت اور طلبہ کے اندر بدنظمی، لاقانونیت اور سرکشی میں اضافہ کا سبب ہوگا، ان کا اصرار تھا کہ امتحان وقت پر ہو اور ان طلبہ کا اخراج کردیا جائے۔ مولانا محمد سہول صاحب بڑی آزمائش میں تھے، انھوں نے کسی طرح اساتذہ کو سمجھایا کہ امتحان اس وقت ملتوی کردیا جاتا ہے پھر جلد ہی لے لیا جائے گا۔ اس سے لڑکوں کو سہولت ہوجائے گی اور قسم توڑنے کا مرحلہ نہیں آئے گا۔ امتحان کے ملتوی ہونے کی خبر طلبہ کو ہوئی لیکن کس طرح؟ مطالبہ منوا کر بھی وہ جیتے نہیں تھے۔ نقد دل ہار چکے تھے، مولانا ان کے سامنے تھے اور ان کی آنکھیں بہہ رہی تھیں، کچھ اس طرح کے الفاظ ان کی زبان پر تھے۔ بچو، میرے بیٹو، اگر کوئی دقت تھی، کچھ پریشانی تھی، کوئی مسئلہ تھا، ہم سے کہا ہوتا، ہم لوگ آخر یہاں کس لیے ہیں، لڑکوں کی ضد جاتی رہی تھی اور اشتعال غائب تھا۔ اب وہ نادم تھے۔ وہ بھی بہت روئے اور مولانا سے معافی مانگی۔ تعلیم اور تعلیم سے بڑھ کر تربیت بڑی حکمت، طلبہ سے غیر معمولی لگاؤ، دلسوزی اور بڑی پتہ ماری کا کام ہے، یہ طلبہ مہمانانِ رسول اور ہمارا مستقبل ہیں، انھیں بنانا اور سنوارنا ہمارا فریضہ منصبی ہے ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں،

وہ شرارت بھی کرتے ہیں، نظم توڑتے اور فرائض میں کوتاہی کرتے ہیں، کبھی کسی بری لت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ایک استاد ان سے آنکھیں نہیں موند سکتا، ترغیب وتشویق سے بھی کام لے گا اور تربیت سے بھی، لیکن اس سب کے باوجود اس کا رویہ ایک باپ کا سا ہوتا ہے وہ کبھی جلاد نہیں بنتا، اس کی سختی میں بھی اپنائیت اور پیار ہوتا ہے۔''

(حیات نو: مئی/جون: ۱۹۹۶)

امتیاز وحید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔نئی دہلی

ایک مدت بعد حیات نو کے تین شمارے جو آپ نے بذریعہ ای میل بھیجے انہیں دیکھ کر جامعۃ الفلاح کی زندگی کی یاد تازہ ہوگئی، حسن البنا منزل میں رہتے ہوئے حیات نو کے لیے کونے کا ایک کمرہ مختص تھا، جو بالکل میرے کمرہ نمبر ۳۸/ کے برابر تھا۔اس طرح مجھے حیات کا پڑوسی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس وقت حیات نو مولانا اسماعیل فلاحی صاحب، اور اس سے قبل مرحوم طارق فارقلیط صاحب اور کچھ مدت کے لیے غالبا میرے استاذ مرحوم نور محمد کی لائق قیادت میں پابندی سے نکلتا تھا۔شاہ پور مولانی سے اس کی کتابت کے لیے ایک کاتب بھی آیا کرتے تھے۔ پڑوسی ہونے کے ناطے میری عملی زندگی کے کئی تجربات حیات نو سے جڑے ہوئے ہیں، مولانا جلیل احسن ندویؒ صاحب کا ایک تذکیری نوٹ جو میرے استاذ مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب نے اپنے دور طالب علمی میں لیا تھا، اور جو نہایت بوسیدہ اور کرم خوردہ حالت میں تھا، مولانا اسماعیل صاحب کے توسط سے اسے صاف کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی، اس طرح سے حیات نو میں یہ پہلا مضمون ہے جو میرے شکریے کے ساتھ شائع ہوا۔یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنے جیب خرچ کے لیے چند ماہ حیات نو میں پارٹ ٹائم کام بھی کیا تھا، اور مولانا اسماعیل صاحب کے ہمراہ اس کی طباعت کے لیے مئو بھی جانا ہوا تھا۔اس وقت ہم حیات نو کے مستقل قاری تھے۔ جامعۃ الفلاح کا زمانہ نظروں سے اوجھل ہوا، تو ہم سے حیات نو بھی جدا ہو گیا۔گاہے بگاہے دوستوں سے اس کی خیریت معلوم ہوتی رہی، تاہم دو دہائی بعد آپ کی ادارت کے یہ تینوں شمارے دیکھ کر جی کو اطمینان ہوا۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ حیات نو نے خود کو محض اپنی سکہ بند روایتی روش اور مشمولات کا پابند نہیں رکھا۔ ماضی کی قدروں کے ساتھ اس میں نسل نو کی ترجمانی کا خوش گوار احساس ہوا۔اسے میں حیات نو کے لیے نیک شگون سمجھتا ہوں۔دلچسپی اور مندرجات میں ہمارے گردوپیش کی زندگی اور فکر کی نمائندگی ہے۔رسالے میں زندگی کا پتہ چلتا ہے۔نئی تبدیلیوں کے ساتھ حیات نو کو وقت سے ہم آہنگ کرنے کی آپ کی کوشش کی قدر کی جانی چاہئے۔قدیم فلاحیوں کی یادداشت اور تجربات پر مشتمل آپ کا کالم بہت عمدہ ہے۔اس سے جامعۃ الفلاح کے نظام تعلیم وتربیت کے محاسن پر روشنی پڑتی ہے۔اس نوع کی تحریر میں نظام فلاح کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی ہو، تو انہیں فیڈ بیک کے طور پر جمع کر کے فلاح کے نظام میں بہتری لانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔سنا ہے مطبخ کے قدیم نظام کی جگہ ٹفن سسٹم نے لے لی ہے، انتظامیہ کو اس کے فوائد کا صحیح علم ہوگا، لیکن مجھے میرے

بچپن کا ایک نظام مسمار ہوتا ہوا نظر آتا ہے، جو اتحاد، فعالیت اور جذبے کی تعلیم سے معمور تھا۔

میری خواہش ہوگی کہ آپ حیات نو میں ان فلاحی بھائیوں سے ان کی متعلقہ فیلڈ میں کریئر کے امکان پر چند عملی باتیں بھی لکھوا سکیں تو نئی نسل کے سامنے کریئر آپشن کی عملی دقتیں، امکان اور راستے آسکیں گے، اور ان کی رہنمائی بھی ہوگی، اسی طرح مختلف اعلی تعلیمی اداروں میں فارغین مدارس کی راہ کی عملی دقتوں کو بھی حیات نو کے مندرجات میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جامعۃ الفلاح کے لیے اپنے نظام اور نصاب تعلیم میں صحت مند تبدیلیوں کے لیے عملی راہیں استوار کرنا آسان ہوگا۔

<u>ڈاکٹر محمد افضل فلاحی، بلریا گنج، رکن شوریٰ جامعۃ الفلاح</u>

کہ آسماں بھی تیری رفعتوں پہ ناز کرے

حیات نو کا تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء میرے یہاں پہنچا۔ گزشتہ شماروں کی طرح تازہ شمارے کا بھی از اول تا آخر بغور مطالعہ کیا۔ بے انتہا خوشی و مسرت ہوئی۔ نیز یہ احساس بھی ہوا کہ کسی بھی شئے کا زندہ رہنا نہیں بلکہ زندہ نظر آنا ضروری ہے۔ حیات نو دوران طالب علمی سے میرے مطالعہ میں رہا ہے، اس وقت بھی یہ رسالہ اپنے وقت پر ایک بڑی تعداد میں شائع ہو رہا تھا، اور قارئین تک بآسانی پہنچ رہا تھا، لیکن اُس وقت علمی، فکری، تحقیقی اور دعوتی مضامین کے لحاظ سے یہ بہت معیاری مجلّہ نہیں تھا۔ آج حیات نو میں آپ نے جس طرح سے روایتی سطحیت اور فلسفیانہ موشگافیوں کے برخلاف علمی، تحقیقی، دعوتی، اصلاحی، قومی وملی مسائل، اور حالات حاضرہ پر خالص داعیانہ اسپرٹ کے ساتھ لکھی گئی تحریروں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے، نیز خصوصی کالم، آپ کے خطوط، اور بزم ادب جیسے مستقل کالمس شروع کیے ہیں، ان سے یہ رسالہ ہند و بیرون ہند کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنا نمایاں اور منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ دعا ہے کہ مجلّہ اپنے مقاصد کو اور بہتر طور سے پورا کرنے میں کامیاب و کامران ہو، اللہ تعالی مدیر موصوف کی سعی کو بارآور فرمائے، اور ان کے نیک عزائم کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین

<u>مفتی سہیل احمد فلاحی قاسمی، بھوپال۔ مدھیہ پردیش</u>

سہ ماہی حیات نو (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء) موصول ہوا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مرحوم طارق فارقلیط صاحب فلاحی پر خصوصی گوشہ دیکھا۔ جس میں مختلف اصحاب نے مرحوم فارقلیط صاحب کی شخصیت پر اپنے اپنے تأثرات کا اظہار کیا ہے۔ مولانا سے میری ملاقات بھی کافی عرصے سے رہی ہے، جماعت کی مختلف ذمہ داریوں کے دوران ان کا جامعۃ الفلاح اور اطراف میں دورہ ہوتا رہتا تھا۔ اس دوران ان سے مستقل استفادے کا موقع ملتا رہا۔ وہ نوجوانوں، بالخصوص تحریکی نوجوانوں سے خاص تعلق رکھتے تھے، ہمیشہ راقم سے تعلیمی اور تحریکی سرگرمیوں کے تعلق سے دریافت کرتے، مختلف امور میں رہنمائی فرماتے، اور خوب دعاؤں سے نوازتے، اللہ تعالی مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح

عصرِ حاضر میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت پر دوروزہ قومی سیمینار

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی نشاۃ ثانیہ میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان کے تعلیمی افکار ونظریات اور خدمات پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ شبلیؒ نے تعلیم کے سلسلے میں نظریاتی مباحث قائم کئے، تعلیمی اداروں کو فروغ دیا، اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے افراد کی تیاری کی ہے جنہوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (ڈائرکٹر شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ) نے جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے زیر اہتمام ''عصر حاضر میں شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت'' کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ قومی سیمینار (۲۵۔۲۴/اکتوبر۲۰۱۴) کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے افتتاحی سیشن کی صدارت فرمائی جبکہ ڈاکٹر ابرار احمد اعظمی، جناب شمیم طارق، سید فیصل علی (گروپ ایڈیٹر راشٹریہ سہارا)، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا ابرار احمد اصلاحی (مکہ مکرمہ) بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جبکہ تعلیم کے میدان میں مختلف تجربات کیے جارہے ہیں اور تعلیمی ترقیات کے حوالے سے حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر کوشش کی جارہی ہے ایسے وقت میں شبلی کے تعلیمی افکار کے حوالے سے اس سیمینار کا انعقاد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کو اپنا استاذ بتاتے ہوئے کہا کہ میری فکر سازی اور ذہن سازی میں مولانا کی نگارشات اور تحقیقات کا سب سے اہم رول رہا ہے۔

بعد نماز مغرب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی کی صدارت میں مقالات کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر مولانا محمد عارف عمری (اصلاح تعلیم کا منہاج شبلی) مرزا محمود فلاحی (جھود العلامۃ الشبلی فی اصلاح التعلیم) آصف اعظمی فلاحی (شبلی کے تعلیمی افکار کی فکری معنویت) مولانا نسیم ظہیر اصلاحی (مدرسۃ الاصلاح اور شبلی) جناب شہنواز فیاض (اعظم گڑھ کی تعلیمی ترقی اور شبلی) ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (شبلی و مودودی کے تعلیمی نظریات) ڈاکٹر محمد ارشد فلاحی (دارس کا نصاب اور شبلی) مقالات پیش کئے۔

صبح کا اجلاس نائب ناظمِ جامعہ مولانا مقبول احمد فلاحی کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس موقع پر ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی (سرسید اور شبلی)، رضوان احمد رفیقی (مدارس اسلامیہ کا نصاب اور نظریۂ شبلی)، ڈاکٹر عمیر منظر فلاحی (ندوۃ العلماء مکاتیبِ شبلی کی روشنی میں)، ڈاکٹر جرار احمد فلاحی (شبلی بحیثیت ماہرِ تعلیم)، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی (فارغین مدارس کا مطلوبہ کردار، شبلی کے حوالہ سے)، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (شبلی کا معجون مرکب)، ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی (ندوۃ العلماء اور شبلی)، مولانا محمد اسماعیل فلاحی (منہجِ تدریسِ قرآن، شبلی کے حوالے سے) نے مقالات پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت شیخ التفسیر مولانا نظام الدین اصلاحی نے فرمائی۔اس اجلاس میں مولانا نعیم الدین اصلاحی (مدرسۃ الاصلاح کی تعمیر وترقی میں علامہ شبلی کا حصہ)، ڈاکٹر علاؤ الدین اصلاحی (علامہ شبلی اور شبلی کالج)، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی (شبلی کے افکار تعلیم کی تشکیل میں کارفرما عناصر)، جناب شمیم طارق (علامہ شبلی کی بلند نگاہی، تعلیمی افکار کے حوالہ سے) نے مقالات پیش کیے۔

مختلف شخصیات کی جامعہ آمد

جامعہ میں وقتاً فوقتاً مختلف میدانوں کے ماہرین اور ملک وملت کی اہم شخصیات کو مدعو کیا جاتا ہے، تاکہ وقت اور حالات کے تناظر میں مختلف اہم اشوز پر طلبہ کو مستفید کیا جاتا رہے، اس سہ ماہی میں درج ذیل اسکالرس اور اہم شخصیات سے طلبہ کو مستفید ہونے کا موقع ملا:

- **مولانا محمد جعفر**، نائب امیر جماعت اسلامی ہند
- **جناب اعجاز احمد اسلم**، سکریٹری شعبہ میڈیا جماعت اسلامی ہند
- **مفتی برکت اللہ قاسمی**، ماہر اسلامک بینکنگ، حال مقیم برطانیہ
- **ڈاکٹر کوثر عثمانی**، اسوسی ایٹ پروفیسر میڈیسن کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی لکھنؤ
- **مولانا انعام اللہ فلاحی**، شعبہ تعلیمات مرکز جماعت اسلامی ہند

معمل اللغة کی سرگرمیاں

- **سہ ماہی مجلہ القلم کا اجراء**

۱۵ر نومبر بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں معمل اللغۃ کی جانب سے ایک سہ ماہی عربی مجلّہ ''القلم'' کا اجراء جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی کے ہاتھوں ہوا۔ یہ مجلّہ جناب مولانا محمد اکمل فلاحی کی ادارت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔اس مجلّہ میں اساتذہ کرام کے علاوہ طلبہ کے بھی عربی مضامین شامل ہیں۔

- **محترم ناظم جامعہ کا توسیعی لکچر**

۱۷ر نومبر ۲۰۱۴ بروز شنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں ''صفات الناجحین'' کے عنوان پر عربی

زبان میں محترم ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی کا ایک لیکچر معمل اللغۃ کے زیر اہتمام ہوا۔

● عربی تقریری مسابقہ

۳۰رنومبر۲۰۱۴ بروز چہارشنبہ کلیۃ الدعوۃ میں معمل اللغۃ کی جانب سے ایک عربی تقریر کا مسابقہ ہوا۔ یہ مسابقہ دو گروپ میں منعقد ہوا۔ اس مسابقہ میں اول، دوم، سوم آنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا، جبکہ شریک ہونے والے طلبہ کو بھی تشجیعی انعامات سے نوازا گیا۔ دونوں گروپ کے کامیاب ہونے والے طلبہ کی فہرست درج ذیل ہے:

گروپ اول: (۱) محمد اسرائیل (اول) (۲) محمد اعجاز الحق (دوم) (۳) محمد مکرم خاں (سوم)

گروپ دوم: (۱) عبداللہ عیسیٰ (اول) (۲) محمد اطہر فیروز (دوم) (۳) تنویر احمد (سوم)

● معمل اللغۃ میں شریک طلبہ کی حوصلہ افزائی

۱۳رنومبر بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں معمل اللغۃ کی جانب سے ایک مختصر پروگرام منعقد ہوا۔ اس پروگرام کے کنوینر جناب محمد اکمل فلاحی تھے۔ اس موقع پر معمل اللغۃ کی جانب سے مغرب وعشاء کے بعد چلنے والی کلاسوں میں جو طلبہ بھی شریک رہے، انہیں انعامات سے نوازا گیا۔

● طلبہ کو العربیۃ للجمیع کی طرف سے ھدیہ

العربیۃ للجمیع عربی زبان کی ترویج واشاعت کے لیے ایک قابل قدر کوشش ہے، جس کا ہیڈ کوارٹر ریاض میں ہے۔ اس ادارہ نے العربیۃ بین یدیک کے نام سے بہترین ریڈر ۳راجزاء میں تیار کیا ہے، اور اس کے ساتھ ایک بہترین کتاب المعلم بھی۔ جامعہ کے طلبہ میں ان کتابوں کی تقسیم ہوئی۔

جامعہ میں تعطیل اور سہ ماہی امتحانات

اعلان کے مطابق ۴راکتوبر۲۰۱۴ بروز شنبہ جامعہ میں عیدالاضحیٰ کی تعطیل ہوئی اور ۱۰راکتوبر۲۰۱۴ بروز جمعہ تک چھٹی جاری رہی۔ اعلان کے مطابق ۲۷راکتوبر۲۰۱۴ بروز دوشنبہ سے جامعہ میں سہ ماہی امتحان کا آغاز ہوا۔ یہ امتحان ۳رنومبر۲۰۱۴ بروز دوشنبہ تک جاری رہے اور ۴رنومبر سے باقاعدہ دوسری سہ ماہی کا آغاز ہوگیا۔

مولانا محمد اسماعیل فلاحی کی جامعہ سے رخصتی پر الوداعی نشست

۲۴رنومبر۲۰۱۴ء بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں ایک الوداعی نشست جناب مولانا محمد اسماعیل فلاحی شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح کے جامعہ سے رخصت ہونے پر منعقد کی گئی۔ اس نشست کی نظامت مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صدر مدرس شعبہ اعلی جامعۃ الفلاح نے فرمائی۔ مولانا انیس احمد فلاحی مدنی نے اپنی افتتاحی گفتگو میں فرمایا کہ استاذ محترم جناب مولانا محمد اسماعیل فلاحی ایک باکمال اور باصلاحیت استاذ تھے۔ میں

نے آپ کو ہمیشہ نظم وضبط کا پابند پایا۔ اگر آپ کو کہیں بھی جانا ہوتا تو ہمیشہ بتا کر جاتے۔ استاذ محترم نے ہمیشہ طلبہ کو اپنا فیض پہنچایا۔ اس موقع پر مولانا محمد عمران خاں فلاحی، مولانا نعیم الدین اصلاحی اور مہتمم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے اپنے تأثرات پیش کئے۔ مولانا محمد اسماعیل فلاحی نے اپنے تأثرات میں فرمایا کہ میرا جامعہ سے گہرا تعلق ہے، میں تقریباً چار دہائیوں سے جامعہ سے وابستہ ہوں، میں نے سب کچھ یہیں سے سیکھا ہے۔ میں نے مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اور مولانا جلیل احسن ندوی علیہ الرحمۃ سے بہت استفادہ کیا ہے، میری خواہش ہے کہ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کو واپس جامعہ تشریف لانے کی دعوت دی جائے۔ اسی طرح موصوف نے فرمایا کہ میرا احساس ہے کہ جامعہ میں آزادئ فکر ونظر کی فضا میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے، یہ باعث تشویش ہے۔ اگر میری ذات سے کسی کو کچھ بھی تکلیف پہنچی ہے تو اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے اپنے تأثرات بیان کرتے ہوئے کہا آپ ایک باکمال استاذ تھے، آپ کے جانے سے ہمیں تکلیف ہے، اللہ آپ کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے۔ آخر میں مولانا نظام الدین اصلاحی کی دعا پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔

ابراہیم وکیل صاحب کی جامعہ سے رخصتی پر الوداعی تقریب

یکم نومبر ۲۰۱۴ بروز شنبہ ابواللیث ہال میں ایک الوداعی تقریب جناب ماسٹر ابراہیم صاحب کی جامعہ سے رخصتی کے سلسلے میں رکھی گئی۔ اس موقع پر جناب مولانا انیس احمد فلاحی (صدر شعبہ اعلیٰ)، جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی، جناب مولانا محمد عمران فلاحی، اور جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی نے اپنے تأثرات پیش کئے۔ واضح رہے کہ اس تقریب میں شعبہ اعلیٰ کے تمام ہی اساتذہ شامل تھے۔

مولانا اقبال احمد قاسمی اب نہیں رہے

جامعہ کے سابق استاد جناب مولانا اقبال احمد قاسمی صاحب ۲ر نومبر ۲۰۱۴ بروز شنبہ مطابق ۹ر محرم الحرام ۱۴۳۶ھ اپنے گھر قصبہ بلریاگنج میں قیام کے دوران اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے۔ آپ نے جامعہ میں تقریباً ۱۵ر سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۲۸ر سال سے آپ برطانیہ میں مقیم تھے۔ انتقال کے وقت تقریباً ۸۳ر سال عمر تھی۔ دو سال سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ آپ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹے لندن میں مقیم ہیں اور ایک بیٹے جاوید احمد صاحب جامعۃ الفلاح کے شعبہ امتحانات میں کارکن ہیں۔ آپ کی نماز جنازہ جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے پڑھائی، جبکہ جامعہ کے طلبہ واساتذہ نماز جنازہ میں شریک رہے۔

● فارغین جامعہ کے عرب یونیورسٹیز میں داخلے پر صدر انجمن رضوان احمد رفیقی کی مبارکباد

گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی متعدد فارغین جامعہ کا عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیز میں داخلہ ہوا، ادارہ حیات نو کو موصول ہوئی اطلاعات کے مطابق جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور جامعۃ الامام ریاض میں درج ذیل فلاحیوں کی منظوری آ چکی ہے:

جامعة الامام رياض

۱۔عمار جاوید سلطان خان

۲۔ذوالقرنین حیدر سبحانی

۳۔نعمان قطب

جامعة اسلامية مدينة منورة

۱۔محمد انس سنبھلی

۲۔تابش ذکی

اس موقع پر مبارکباد دیتے ہوئے صدر انجمن جناب رضوان احمد رفیقی فلاحی نے کہا کہ یہ خبر ہم تمام فلاحی برادران کے لیے خوشی اور مسرت کی باعث ہے، تمام فلاحی برادری کی جانب سے اِن ساتھیوں کو ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے ان ساتھیوں کو نہ صرف جامعہ اور تحریک اسلامی ہند بلکہ تمام ملک وملت کے لیے ایک قیمتی اثاثہ بنائے۔ یقیناً اس کے لیے ہمارے ساتھیوں کو سخت محنت اور جدوجہد کرنا ہوگی، اپنا مطالعہ وسیع تر کرنا ہوگا، اپنے عزائم بلند رکھنے ہوں گے، قرآن وسنت سے مضبوط اور گہرا رشتہ قائم کرنا ہوگا، ضرورت ہے کہ اس کے لیے ہم جدوجہد اور سخت جدوجہد کا راستہ اختیار کریں، اللہ تعالی ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

● دھلی یونٹ کا انتخاب

۱۱رنومبر۲۰۱۴ء انجمن طلبہ قدیم دہلی یونٹ کے ممبران کی ایک نشست مرکز جماعت اسلامی ہند میں منعقد کی گئی، اس موقع پر مولانا نسیم غازی فلاحی صاحب کا ایک خصوصی خطاب بھی رکھا گیا۔ اس موقع سے یونٹ کی رپورٹ پیش کی گئی، اس کا جائزہ لیا گیا، نیز سال رواں کے لیے **خالد سیف اللہ اثری فلاحی** کا بحیثیت صدر یونٹ انتخاب عمل میں آیا۔

بعدازاں نومنتخب صدر یونٹ نے اپنی ٹیم کا اعلان فرمایا:

نائب صدر: ظفر امام فلاحی

سکریٹری: عامر جمال فلاحی

اسسٹنٹ سکریٹری: اسامہ شعیب فلاحی

میڈیا انچارج: فلاح الدین فلاحی

رابطہ عامہ: سبطین کوثر فلاحی

خازن: رضوان خان فلاحی

اس موقع پر صدر انجمن طلبہ قدیم رضوان رفیقی فلاحی کے علاوہ نائب صدر انجمن مولانا انعام اللہ فلاحی اور رکن شوری انجمن طلبہ قدیم مشرف حسین صدیقی فلاحی بھی موجود تھے۔

- **کلیۃ البنات میں تعمیری پروجیکٹ پر تیز پیش رفت**

جامعہ کے شعبہ نسواں کلیۃ البنات میں گزشتہ دنوں انجمن کی جانب سے مزید کلاس رومس اور ایک ہال کی تعمیر کا پروجیکٹ کچھ اہل خیر حضرات کے تعاون سے شروع کیا گیا تھا، الحمدللہ اس میں کافی تیز پیش رفت ہوئی ہے، اور بنیادی ڈھانچہ تقریبا مکمل ہونے جا رہا ہے۔

- **ڈاکٹر محی الدین غازی کی آمد پر الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم یونٹ کی خصوصی نشست**

ماہ اکتوبر کے اوائل میں ڈاکٹر محی الدین غازی، ہیڈ آف ریسرچ دارالشریعہ متحدہ عرب امارات کی کیرلا آمد کے موقع پر انجمن کی شانتاپرم یونٹ کی جانب سے ایک خصوصی نشست رکھی گئی، جس میں وہاں موجود تمام ہی فلاحی برادران نے شرکت کی۔ نشست کے آغاز میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فلاحی مدنی نے یونٹ کی ایک مختصر رپورٹ پیش کی، اور تمام ہی شرکاء نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔ تعارف کے بعد ڈاکٹر محی الدین غازی نے خطاب کرتے ہوئے کچھ اہم نکات پر روشنی ڈالی، جس کے بعد سوال وجواب کا ایک طویل سلسلہ چلا۔

- **جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں میں فلاحیوں کی نشست**

محترم صدر انجمن رضوان احمد رفیقی کی جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں آمد کے موقع پر وہاں موجود فلاحی برادران کی ایک نشست رکھی گئی۔ اس مناسبت سے صدر انجمن نے وہاں کے حالات کا جائزہ لیا، اور انجمن کے مرکزی فیصلوں اور سرگرمیوں کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر موجود فلاحی برادران نے بھی انجمن اور جامعہ کے تعلق سے اپنے احساسات اور تأثرات پیش کئے۔